جلد ۸۱

مارچ ۱۹۷۴ء

عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن کے اجزاء

سورۂ الفاتحہ۔ سورۂ البقرہ	۸ر۲۵
سورۂ المائدہ	۲ر۲۵
سورۂ یوسف	۲ر۷۵
سورۂ النّور	۲ر۰۰
سورۂ لقمان	۱ر۶۰
سورۂ الاحزاب	۴ر۵۰
سورۂ الفتح	۲ر۰۵
سورۂ الحجرات	۲ر۲۰
سورۂ الرحمٰن	۱ر۹۰

علیحدہ علیحدہ کتابی شکل میں طلب فرماویں

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ ۱۹۷۴ء مطابق صفر المظفر ۱۳۹۴ھ	جلد ۸۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

زرِ سالانہ دس روپیہ ✻ فی پرچہ ایک روپیہ

ابو الخیر مودودی پبلیشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

محرم الحرام ۱۳۹۴ھ کے اختتام اور صفر المظفر کے آغاز کے دو چار دن نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن ایام میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں سے ایک کو نرم ترین الفاظ میں ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کے سیاہ باب کا نہایت ہی اندوہناک عنوان کہا جاسکتا ہے، یا ایک ایسا المناک حزنیہ جس نے ہر شعور و احساس رکھنے والے مسلمان کو شدید کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اپنے آپ کو ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم پاتا ہے جس میں دُور دراز تک اُسے روشنی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی افسردگی اور بے بسی کا اندازہ اقتدار کے نشہ میں بدمست مگر عوام کی جھوٹی محبت کا دم بھرنے والے افراد نہیں کرسکتے۔ اُن کے غم و اندوہ کو کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے وزیر اعظم بھٹو کی زبان سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے منحوس اعلان کو عوام پر برق بن کر گرتے دیکھا۔ ہم اس ضمن میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ عوام کی نبضوں پر ہاتھ رکھنے والے اس صاحبِ اقتدار کو عوام کے ردِ عمل کا صحیح احساس ہے یا نہیں لیکن ایک بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح فیلڈ مارشل محمد ایوب کے لیے معاہدۂ تاشقند، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی ظفر مندی کے باوجود، اس کے زوال کا باعث بنا، بالکل اسی طرح بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا وزیر اعظم بھٹو کے لیے نقطۂ انحطاط ثابت ہو گا۔

ہم نہیں جانتے کہ مسٹر بھٹو کسی خوش فہمی کی بنا پر یا تجاہلِ عارفانہ کے تحت اس عظیم حادثہ کو ملک کے حق میں نیک فال قرار دے رہے ہیں مگر انہیں اس بات کو بخوبی جان لینا چاہیے کہ چند مفاد پرست لوگوں کے بیانات خواہ وہ گھر کے ہوں یا باہر کے، تلخ حقائق کو خوش کُن حالات میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ جہاں تک گھر کے مفاد پرستوں کا تعلق ہے گزشتہ ۲۵ سال میں ضمیر فروشی کی تربیت نے انہیں دُنیوی مفادات کا اس حد تک پرستار بنا دیا ہے کہ بنگلہ دیش کے معاملے میں وزیر اعظم کی تائید و حمایت تو ایک طرف رہی اگر وہ پورا ملک بھی کسی سامراجی قوت کے سامنے بطور تحفہ پیش کر دیں تو یہ لوگ صاحبِ اقتدار کے اس اقدام کو بھی اس وقت تک سراہتے رہیں گے جب تک کہ وہ مسندِ اقتدار پر فائز ہیں۔ لیکن جس وقت وہ اس سے محروم ہوں گے اور

اُن کی جگہ کوئی دوسرا اس پر قابض ہوگا تو پھر یہ تشہ مقتدر کے ہر اقدام کی تعریف و توصیف شروع کر دیں گے اور سابق حکمران کے ہر کام کو ملک و ملت سے غداری پر محمول کریں گے۔ اِس لیے ان ضمیر فروشوں کے ستائشی کلمات سے وزیرِاعظم صاحب کو خوش نہ ہونا چاہیے۔ یہ لوگ تو ہر اُس شخص کے ثناخواں ہیں جس کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہوتی ہے اور ہر اس شخص سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں جو اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔

اقتدار کے ان پجاریوں کے علاوہ مسٹر بھٹو کو ان اسلام دشمن عناصر کی تائید سے بھی خوش نہ ہونا چاہیے جو اس خطہ پاک کی دینی حیثیت کو مٹانے کے درپے ہیں اور جنھیں یہ تصور بھی شاق گزرتا ہے کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو۔ انہیں اشتراکیت کی سربلندی مطلوب ہے اور اسی کی خاطر وہ ہر اس اقدام کی تائید پر آمادہ رہتے ہیں جس سے اسلام کی بجائے کفر کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے چونکہ دین کی اساس پر قائم ہونے والے تصورِ ملت کو شدید دھچکا لگا ہے اور بقول اندرا گاندھی اُس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مذہب انسانیت کے کسی گروہ کے مابین رشتہ اخوت قائم کرنے میں ناکام رہا ہے" اس لیے اشتراکیت کے مُبلغ اور حامی اور دوسرے لادین عناصر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔

وزیرِاعظم بھٹو کے فیصلے پر مسرت کا اظہار ایک ایسا طبقہ بھی کرتا ہُوا نظر آتا ہے جس کی تائید سے انہیں اطمینانِ خاطر حاصل ہونے کے بجائے پریشان ہونا چاہیے کہ اُن کی حمایت ایسے گھٹیا لوگ کر رہے ہیں جن کی سوچ کی حدِ کمال یہ ہے کہ اس معاہدہ سے بھارت کے ساتھ تعلقات بحال کرنے میں مدد ملے گی اور بالآخر اُن کے لیے بھارتی فلمیں دیکھنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ جن لوگوں کی فکرانی پست ہو ان کی کسی مسئلہ کے بارے میں تائید و حمایت قومی زندگی میں آخر کیا اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ وزیرِاعظم بھٹو اس وقت جن لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ انہیں اصل حقائق سے کبھی بھی آگاہ نہ ہونے دیں گے اور انہیں یہی باور کراتے رہیں گے کہ اُنھوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرکے قوم پر جو عظیم احسان کیا ہے پوری قوم اس کے لیے ان کی شکر گزار ہے اور اُن کے اس سُنہری کارنامے پر انہیں ہدیۂ تبریک پیش کر رہی ہے۔ لیکن اگر وہ ان خوشامدیوں کے نرغے سے کبھی باہر نکل کر لوگوں کے ردّعمل کا جائزہ لیں تو اُن پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ قوم کی عظیم اکثریت اُن کے اس فیصلے کو دل کی گہرائیوں سے غلط اور سخت عاقبت نااندیشانہ سمجھتی ہے جس نے ان کے وقار کو مجروح کر دیا ہے۔ قوم اس وقت اگر خاموش اور مُہر بلب ہے تو اس سے اُنہیں یہ نتیجہ نہ اخذ کر لینا چاہیے کہ "یہاں سب اچھا ہے" اور قوم نے اُن کے فہم و تدبّر پر بھروسہ کرتے ہوئے اُن کے اس فیصلے کی توثیق کر دی ہے اور اُسے اُن کی اس بات کا پورا یقین ہو چکا ہے کہ

تاریخ اس فیصلے کی صحت پر اپنی تصدیق ثبت کر دے گی۔ وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ بے کسی، مجبوری اور بیچارگی کا سکوت اپنی آستینوں میں بہت سے طوفان چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

پھر تاریخ کو جو آپ نے اس معاملے میں بار بار حَکم ٹھہرایا ہے اور حقیقت کو ماننے پر اصرار کیا ہے اس کے بارے میں بھی آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کا باشعور طبقہ اس کی لِم سے ناآشنا ہے اور آپ حقیقت پسندی کے نام پر ان کے ذہنی اضطراب اور خلجان کو طمانیت سے بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت نہ سہی مگر ایک اچھی خاصی تعداد "حقیقت پسندی" کے اس فلسفے کے پس منظر، اس کے مُضمرات اور نتائج سے بخوبی واقف ہے۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح ہیگل کے اس نظریے نے کہ جو موجود ہے وہی حقیقت ہے اور جو حقیقت ہے وہ صحیح ہے یا دوسرے لفظوں میں جو موجود ہے وہی صحیح ہے، اہلِ یورپ کو زندگی کی اعلیٰ اور ارفع اقدار سے محروم کر کے انہیں پست صورتِ حال سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے والا اور ہر قسم کے ظلم و استبداد، بُرائی اور ذلت کے سامنے سرنگوں ہونے والا بنا دیا۔ ہیگل نے تو یہ فلسفہ آمریت کے فروغ اور کش مکش حیات میں ہر جائز و ناجائز حربے کے استعمال کے جواز کے لیے گھڑا تھا۔ مارکس نے اس فلسفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتراکیت کے علمبرداروں کو اس بات کی تربیت دی کہ انہیں ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کر کے کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کیونکہ ان کا اقتدار پر تسلط ہی ان کے صحیح اور برحق ہونے کی واضح دلیل ہے اور عوام کے اندر حقیقت پسندی کے اس فلسفے کا اس لیے پرچار کیا گیا کہ وہ جور و جفا کو حقیقت مان کر اس پر راضی ہو جائیں۔ اگر حقیقت پسندی کے فلسفے کے مُضمرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ہر فرد اور گروہ اور طبقے اور معاشرے کے لیے اس کے مخصوص حالات کے پس منظر میں الگ الگ مفہوم اور معانی رکھتا ہے۔ جباروں، سفاکوں، ظالموں اور زبردست آزاروں کو اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے اس سے سندِ جواز فراہم ہوتی ہے اور کمزوروں، بے بسوں اور مجبوروں کو ظلم و استبداد کے مقابلے میں اعترافِ شکست کی تربیت ملتی ہے۔

حقیقت پسندی کے اس سارے فلسفے میں سب سے بڑا منطقی مغالطہ یہ ہے کہ جو کچھ معرضِ وجود میں آ جائے اُسے صحیح اور برحق تسلیم کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اگر ایک واقعہ ہو گیا ہے تو وہ بلاشبہ حقیقت ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس حقیقت کو صحیح اور برحق بھی مان لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر ایک قاتل کسی بے گناہ انسان کو قتل کر دیتا ہے تو یہ حقیقت تو ضرور ہے لیکن کیا اس حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ قاتل نے مقتول کو بڑی کامیابی کے ساتھ قتل کیا ہے، اس لیے اس کا یہ فعل صحیح اور درست بھی ہے اور

ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کی صحت کا اعتراف کریں۔ اصل چیز حقائق کا اعتراف نہیں بلکہ ان حقائق کے صحیح اور غلط ہونے کا شعور اور ان کے بارے میں صحیح ردِ عمل کا ہے۔ مثلاً چند بد قماش افراد کسی غریب شخص کی بچی کو بالجبر اغوا کر لیتے ہیں۔ اب وہ بے کس شخص اس حقیقت کا کس طرح سامنا کرتا ہے اس کا سارا دارومدار اس طرزِ عمل پر ہے جو وہ اس ظلم کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ ایک طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، آبادی کے شرفاء کے احساسِ شرافت کو ابھارتا ہے، اپنے اقرباء کی غیرت کو بیدار کرتا ہے، جن جن افراد اور حلقوں کے بارے میں اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجرموں پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر اس کی مظلوم بچی کی بازیابی میں کسی طرح مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک وہ اس مظلومہ کو ان کے چنگل سے نجات نہیں دلا لیتا اور اس مقصد کے لیے وہ جان و مال ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص اس اندوہناک تلخ حقیقت کا اعتراف کہ اس کی بچی کو چند بدمعاشوں نے اغوا کر لیا ہے، اس طرح کرتا ہے کہ بچی کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ جس شخص کے گھر میں وہ محبوس ہے اُسے داماد کے طور پر تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ اسی طرح کے راہ و رسم بڑھانے کے لیے کوشاں رہتا ہے جس طرح کہ داماد اور اس کے دوسرے اقارب کے ساتھ بڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بھی اعترافِ حقیقت ہی کی ایک صورت ہے لیکن دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں اعترافِ حقیقت نے ایک غیور شخص کی غیرت کو اُبھارا اور اس کے دل میں ظلم کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کیا اور دوسرے شخص نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے غیرت کو تیاگ دیا، اور ظالم کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہو گیا

جن باتوں کو ہم حقائق کہہ کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہ فطرت کے کوئی ایسے لگے بندھے ضابطے نہیں ہوتے جنہیں تبدیل نہ کیا جا سکے۔ یہ معاشرتی حقائق انسان کی قوتِ عمل سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورج کا ایک خاص سمت میں سفر ایک ایسی حقیقت ہے جس میں انسان کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا مگر تاریخ کے رُخ کو اپنی ہمت سے جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک حقیقت تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بے بس تھے اور کفارِ مکہ ان کے مقابلے میں طاقتور تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس حقیقت کے باوجود حضورؐ نے کفر کو ایک بالاتر قوت کے طور پر کبھی تسلیم نہ کیا اور وہ خود اور ان کے رفقائے کار اس یقین کے ساتھ جد و جہد کرتے رہے کہ حق کو بہر حال غالب ہونا اور باطل کو مٹنا ہی ہے۔ اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اوّل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے فتنۂ مانعین زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد خوفناک حقائق کی صورت میں نمودار ہوئے مگر انہوں نے ان کے ساتھ کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا کی اور کفر کی یلغار کے یہی ٹھوس حقائق خواب

پر پشیاں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئے۔

معاشرتی حقائق کا چونکہ اخلاق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے اخلاق کی معمولی حس رکھنے والے افراد اور قومیں ان حقائق کو اسی وقت تسلیم کرتی ہیں جب اُن کی نگاہ میں اُن کے وجود کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہو۔ کشمیر ربع صدی سے بھارت کے قبضے میں ہے اور یہ ایک حقیقت ہے لیکن پاکستان اس حقیقت کو اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ بھارت کا اس خطے پر قبضہ عدل و انصاف کے سراسر منافی ہے۔ جس اصول پر ملک کی تقسیم ہوئی تھی اس کی رو سے مسلم اکثریت کے اس علاقے کو پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔ بھارت نے ننگی جارحیت کا مظاہرہ کرتے اور عدل و انصاف کے سارے ضابطوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے پاکستان کے اس حصے پر بالکل ناجائز طور پر قبضہ کر لیا۔ اب اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لو تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ ہمیں یہ درس دے رہا ہے کہ تم بھارت کی جارحیت اور اس کے اس ناجائز قبضہ کو برحق مان لو۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے پر روس قابض ہو گیا اور دوسرا حصہ امریکہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس ملک کی دو حصوں میں تقسیم بالکل حقیقت ہے جس پر ساری دُنیا گواہ ہے مگر گزشتہ تیس سال سے المانیہ کے باشندے اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے کیونکہ وہ اس تقسیم کو غلط اور جارح اقوام کے اس فیصلے کو ناانصافی پر مبنی سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک نہیں متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کے تخلیق کردہ حقائق کا اعتراف اسی وقت کیا جاتا ہے جب وہ اخلاقی اعتبار سے تسلیم کرنے کے قابل ہوں اور اگر اس نقطۂ نظر سے وہ صحیح نہ ہوں تو انہیں پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں تاریخ کے فیصلے کا ذکر فرماتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط ہُوا ہے تو مستقبل اسے غلط قرار دے کر مٹا دے گا اور اگر یہ صحیح ہُوا ہے تو مستقبل اس کی صحت کی تصدیق کر دے گا۔ تاریخ کا فیصلہ بلاشُبہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن وزیراعظم کو اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تاریخ کے جس فیصلے کا وہ ذکر فرما رہے ہیں یہ وہ فیصلہ نہیں جس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں انسانی فہم کچھ سوچنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ کسی فرد کی کوئی ذاتی رائے بھی نہیں جس کی صحت کی تصدیق بغیر کسی بہت بڑی قربانی کے آسانی کے ساتھ کی جا سکے۔ معلوم نہیں کہ انہیں اس بات کا احساس ہے یا نہیں کہ وہ اپنے جس اقدام کے بارے میں تاریخ کے فیصلے کے طلبگار ہیں اس کا تعلق ان کی ذات سے کہیں زیادہ اُن کی قوم بلکہ پوری ملت اسلامیہ سے ہے اور جس چیز کو وہ تاریخ کے فیصلے کا نام دے رہے ہیں وہ درحقیقت وہ انجام ہے جس پر وہ قوم کو پہنچا

کہ اس کا حشر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی حساس اور صاحب بصیرت شخص اپنے آپ کو یا اپنے اہل و عیال کو انجام کے سپرد کر کے اپنے کسی فعل کے نتائج دیکھنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی دانشمند شخص اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے لختِ جگر کو آگ میں جھونک کر یا اُسے بُری صحبت میں گرفتار کر کے اس کے بھیانک انجام سے اُسے آگاہ کرے۔ دردمند لوگ تو ان افراد کو بھی حوادث کی اُن بے مروت لہروں کے سپرد کرنا گوارا نہیں کرتے جو اُنہیں خوفناک انجام سے دوچار کر دیں۔ وہ انہیں اُن کی دستبرد سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ کُجا آپ کہ اپنی قوم کو حوادث کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر انہیں انجام سے آگاہ کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید نے نوعِ انسان کو گزرے ہوئے حالات و واقعات سے عبرت پکڑنے کی جو بار بار تلقین کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوعِ بشری انسان کی غلط روش خصوصاً جب کہ یہ روش اجتماعی معاملات میں ہو، کی تباہ کاریوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں رکھتی اس لیے اسے اس خطرناک راہ سے بار بار گزرنے سے متنبہ کیا جاتا ہے اور اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اُن کے انجام کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان خوفناک راہوں سے بچانے کی فکر کرے۔ انسان تو کسی بے جان شے پر ایک تجربہ گاہ کے اندر بھی کوئی خوفناک تجربہ کرتے ہوئے سخت خوف محسوس کرتا ہے وہ آخر ذی روح انسانوں کی زندگی کے ساتھ وسیع تر انسانی برادری کے دائرے میں آگ کا کھیل کھیلنا کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ جب کہ اُسے ماضی کے واقعات صاف طور پر بتا رہے ہوں کہ اس خطرناک کھیل سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں ہم اس قسم کے تجربات بار بار کر کے ان کا بھیانک انجام دیکھ چکے ہیں۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے یو۔ این۔ او کے کہنے پر کشمیر میں فائر بندی کا جو اقدام کیا اس کے نتائج قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا جو فیصلہ کیا اس سے ان کی ذات کو تو اس کے علاوہ اور کوئی نقصان نہ پہنچا کہ مہذب دُنیا میں ان کی رسوائی ہوئی مگر قوم آمریت کی زنجیروں میں جکڑی گئی۔ فیلڈ مارشل ایوب صاحب نے مارشل لا نافذ کر کے اپنی دانست میں اصلاح احوال کا ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ مگر تین چار سال کے تجربات نے ہی انہیں اس راہ کی تباہ کاریوں سے روشناس کرا دیا، چنانچہ وہ خود تو ہر چیز چھوڑ چھاڑ کر آرام سے ایک طرف بیٹھ گئے اور آمریت کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں قوم آ گئی۔

بالکل یہی حال بھٹو صاحب کے اس فیصلے کا ہے جس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں وہ عوام کو تاریخ کی عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ تاریخ اپنا فیصلہ اس وقت تک محفوظ رکھتی ہے جب تک کہ کوئی قوم اپنے کیے کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتی۔ جس طرح لیاقت علی خاں کے اقدام، غلام محمد کے اقدام،

جسٹس محمد منیر کے اقدام، فیلڈ مارشل ایوب صاحب کے اقدام، اور خود اُن کے اپنے اس اقدام کہ انہوں نے اکثریتی پارٹی کے حکومت کرنے کے حق کو تسلیم نہ کیا، کے ہولناک نتائج سے خود تو محفوظ رہے مگر ان کی ہولناکیوں سے قوم بچ نہ سکی۔ بالکل اسی طرح بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا دوسرے لفظوں میں بھارت کی اندھی بہری جارحیت کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے انجام سے خود تو محفوظ و مامون رہیں گے۔ لیکن اس غلطی کا خمیازہ ان لوگوں کو بھگتنا پڑے گا جس کا اس فیصلے میں قطعاً کوئی ہاتھ نہ ہو گا۔ آخر یہ کیس قدر ناانصافی ہے کہ قوم کا کوئی سربراہ اپنے ذاتی مصالح اور رجحانات کے پیش نظر ایک فیصلہ کرے اور پھر قوم سے یہ کہے کہ تم اس کی تباہ کاریوں کا سامنا کرو۔

گزشتہ ۲۵ سال میں ہمارے سربراہوں نے وہ کونسا ایسا فیصلہ کیا ہے جس کے نتائج اس ملک کے سنجیدہ طبقوں کے خدشات کے برعکس رونما ہوئے ہیں۔ اس ملک کی عظیم اکثریت حکمرانوں کو بار بار اس بات کی طرف متوجہ کرتی رہی ہے کہ اسلام کے بغیر اس ملک کا بقا ناممکن ہے اس لیے اللہ کا جو دین ہماری قومی زندگی کے لیے شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے معاملے میں خلوص اور سنجیدگی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے مگر ہمارے حکمرانوں نے اس صحیح مشورے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے جس رشتے نے یہاں کے مائل بہ انتشار اجزا کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا وہ کمزور ہوتا گیا اور پاکستانی قوم چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹنے لگی اور ان میں سے ہر ایک نے علیحدگی کا مطالبہ شروع کیا۔ مشرقی پاکستان بھی اس رشتے کے مضمحل ہونے کی وجہ سے بنگلہ دیش کے نام پر ایک لادینی ریاست میں تبدیل ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ کیا کسی ایک مرحلے پر بھی قوم کے بہی خواہوں نے حکمرانوں کو ان کے غلط اقدام پر متنبہ کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے غلام محمد کو بروقت متنبہ کیا، فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کو مختلف مراحل پر بڑی دلسوزی کے ساتھ اُن کے بعض فیصلوں کی غلطی دلائل کے ساتھ ان پر واضح کرنے کی کوشش کی، سہروردی اور سکندر مرزا کے مخلوط انتخاب کے معاملے میں بے جا اصرار کے نتائج سے پوری قوم کو روشناس کیا۔ پھر شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی پروگرام، صدر یحییٰ کی پے در پے حماقتوں اور بھٹو صاحب کی اُدھر تم اور اِدھر ہم کی رٹ کے خطرناک عواقب کی نہایت واضح الفاظ میں نشان دہی کی مگر افسوس کہ حکمرانوں نے ان کی ایک نہ سنی اور قوم کو تباہی کے راستے پر مسلسل آگے بڑھاتے گئے۔

ہم سقوط ڈھاکہ سے لے کر آج تک یہ بات برابر کہہ رہے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ایک عاقبت نااندیشانہ فیصلہ ہے اور آج پھر کسی فرد یا گروہ کی دشمنی میں نہیں، کسی سطحی جذباتیت کے زیر اثر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ وزیر اعظم بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

دعوتِ حق کے لیے ہدایات

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں

—— (۲) ——

سخت مخالفانہ ماحول میں دعوت الی اللہ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (حٰم السجدہ۔ آیت ۳۳)

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ مَیں مسلمان ہوں۔

اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان کو تسکین دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بعد اب اُن کو اُن کے اصل کام کی طرف رغبت دلائی جارہی ہے۔ پچھلی آیات میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اب اُن کو بتایا جارہا ہے کہ آگے کا درجہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ مَیں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے

کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

بدی کا مقابلہ بہترین نیکی سے آگے چل کر فرمایا

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (آیت ۳۴)

اے نبی، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپؐ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپ پر چسپاں کیے جا رہے تھے۔ اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں۔ جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہلڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ کی تاک میں لگا رہے اور جب بھی آپ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کا زور توڑنے کے لیے یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھا لائے ہوں جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اُس کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار، انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس

نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اُس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھُل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو کر منظرِ عام پر آئیں، تو ایسی حالت میں ایک مدّت کی کش مکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو۔ یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں۔ بے شک یہ ایک نیکی ہو گی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھُل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچا لیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدۂ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دُنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور اُن کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عقرب کا زہر ملا پن ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شرِ مجسّم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسّم انسان کمیاب ہیں۔

دعوتِ حق میں صبر کی اہمیت پھر ارشاد ہوا:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (آیت ۳۵)

یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔

یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامّل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے، جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اُسے اُس کے مقامِ بلند سے نیچے اتار لانے اور بے صبر کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

اور یہ جو فرمایا کہ "یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں"، تو یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اُسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں، اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔

شیطان کی اشتعال انگیزی سے خدا کی پناہ آخر میں فرمایا:

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔ (آیت ۳۶)

"اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اُکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔"

شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں اور خصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کروا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب، بُرائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فلاں رکیک حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں، مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راستبازی

کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ اُن کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں اُن کی طرف سے کوئی بیجا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی کوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بہت ہی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو ان کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانا مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو۔ وہ بڑا درد مند اور خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو مُنہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے۔ اور اس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمد نے اپنی مُسند میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابو بکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سُنتے رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مُسکراتے رہے۔ آخر کار جناب صدیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں اُسے ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضورؐ پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپؐ فوراً اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ بھی اُٹھ کر آپؐ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ خاموش مُسکراتے رہے۔ مگر جب میں نے اُسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو گئے؟ فرمایا "جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اُس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آگیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

داعیِ حق کا اپنے کام میں بے غرض ہونا دعوتِ حق میں داعی کا ہر ذاتی غرض سے پاک ہونا اُس کے مخلص اور راستباز ہونے کی ایک نہایت اہم اور صریح دلیل ہے۔ قرآن پاک میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ نبی دعوت الی اللہ کا جو کام کر رہا ہے اس سے خود اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے اس کام میں اپنی جان کھپا رہا ہے۔ سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا، اِنْ	"اے نبی، کہہ دو کہ میں اِس (تبلیغ و ہدایت کے کام)
هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (آیت ۹۰)	پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک

عام نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے"

سورۂ یوسف میں فرمایا :

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (آیت ۱۰۴)

"اور اے نبی، تم اس کام پر اُن سے کوئی اجر نہیں مانگ رہے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دُنیا والوں کے لیے عام ہے"

اس خطاب کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر اصل مخاطب کفار کا مجمع ہے اور اُس کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ کے بندو، غور کرو، تمہاری یہ ہٹ دھرمی کس قدر بے جا ہے۔ اگر پیغمبر نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے دعوت و تبلیغ کا یہ کام جاری کیا ہوتا، یا اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی چاہا ہوتا تو بے شک تمہارے لیے یہ کہنے کا موقع تھا کہ ہم اس مطلبی آدمی کی بات کیوں مانیں۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص بے غرض ہے، تمہاری اور دنیا بھر کی بھلائی کے لیے نصیحت کر رہا ہے اور اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اس کا مقابلہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ کرنے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ جو انسان سب کے بھلے کے لیے ایک بات بے غرضی کے ساتھ پیش کرے اس سے کسی کو خواہ مخواہ کیوں ضد ہو؟ کھُلے دل سے اس کی بات سُنو، دل کو لگتی ہو تو مانو، نہ لگتی ہو تو نہ مانو۔

سورۂ مومنون میں فرمایا :

أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (آیت ۷۲)

"اے نبی، کیا تم ان سے کچھ مانگ رہے ہو؟ تمہارے لیے تمہارے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے"

یعنی کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہے ہیں کہ کوئی نفسانی غرض آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اچھی خاصی تجارت چمک رہی تھی، اب افلاس میں مبتلا ہو گئے۔ قوم میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ہر شخص ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ اب گالیاں اور پتھر کھا رہے ہیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ چین سے اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔ اب ایک ایسی سخت کش مکش میں پڑ گئے ہیں جو کسی دم قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ بات وہ لے کر اُٹھے ہیں جس کی بدولت سارا ملک دشمن ہو گیا ہے، حتیٰ کہ خود اپنے بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خود غرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خود غرض آدمی اپنی قوم اور قبیلے کے تعصبات کا علمبردار بن کر جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اُٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصبات

کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اُس چیز کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جس پر مشرکین عرب میں اس کے قبیلے (قریش) کی چودھراہٹ قائم ہے۔

سورۂ سبا میں فرمایا:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (آیت ۴۷)	"اے نبی، کہہ دو کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے"۔

پہلے فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہی کو مبارک رہے۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہاری اپنی بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ الزام لگانے والے جو چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔

سورۂ صٓ میں فرمایا:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ (آیت ۸۶)	"اے نبی، کہہ دو کہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی آدمیوں میں سے ہوں"۔

یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اطلاع کے لیے نہیں کہلوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضور کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انہی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم میں کسی شخص نے کبھی ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سُنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

سورۂ طور اور سورۂ القلم میں فرمایا:

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (طور، آیت ۴۰۔ القلم، آیت ۴۶)	"اے نبی، کیا تم ان سے کوئی اجر مانگ رہے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے

جا رہے ہوں“؟

سوال کا اصل روئے سخن حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ کفار کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رسول تم سے کوئی غرض رکھتا اور اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا تو اس سے تمہارے بھاگنے کی کم ازکم ایک معقول وجہ تو ہوتی۔ مگر تم خود جانتے ہو کہ وہ اپنی اس دعوت میں بالکل بے غرض ہے اور محض تمہاری بھلائی کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس کی بات ٹھنڈے دل سے سننے تک کے روادار نہیں ہو؟ اس سوال میں ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ ساری دنیا کے بناوٹی پیشواؤں اور مذہبی آستانوں کے مجاوروں کی طرح عرب میں بھی مشرکین کے پیشوا اور پنڈت اور پروہت کھلا کھلا مذہبی کاروبار چلا رہے تھے۔ اس پر یہ سوال اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ایک طرف یہ مذہب کے تاجر ہیں جو علانیہ تم سے نذریں اور نیازیں اور ہر مذہبی خدمت کی اجرتیں طلب کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص کامل بے غرضی کے ساتھ، بلکہ اپنے تجارتی کاروبار کو برباد کر کے تمہیں نہایت معقول دلائل سے دین کا سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ صریح بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اس سے بھاگتے اور اُن کی طرف دوڑتے ہو؟

اس سلسلے میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس کے بارے میں کچھ بحث پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ۔ آیت ۲۳)

”اے نبی، کہو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بجز قرابت کی محبت کے“۔

اس آیت میں لفظ قُربیٰ جو استعمال ہوا ہے اس کے معنی میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہو گیا ہے:

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم ازکم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو“۔ یہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سُدی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ ”قُربیٰ“ کو قُرب اور تقرُّب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قُرب کی چاہت پیدا ہو جائے“۔ یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصری سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طبرانی کی ایک روایت

میں ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے :

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان - ۵۷)

"ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔"

تیسرا گروہ "قربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبیر اور عمرو بن شُعیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکۂ معظمہ میں سورۂ شوریٰ نازل ہوئی ہے اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کُھلّم کُھلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دُنیا جانتی ہے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ، آپ کے والد ماجد اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقرباء میں سے آپ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبت کو اُنہی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوتِ الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مقام سے اس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ ربّ العالمین کے ذمّہ ہے (یونس ۷۲۔ ہود ۲۹-۵۱۔ الشعراء ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰)۔ سورۂ یٰسٓ میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱)۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں جیسا کہ اوپر ہم نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ

کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آرہی ہے، اور آگے بھی روئے سخن اُنہی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ اُن سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔

آغازِ دعوت میں عقیدۂ آخرت پر زیادہ زور دینا مکہ معظمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپؐ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس دُنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دُنیا میں کام کیا تھا، پھر اُن کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اِس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

اِن میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسرے جن جن کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اس لیے جھگڑا صرف اس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات، و اختیارات اور اُلوہیت کی ذات میں اُن معبودوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو مکے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اس امر سے انکار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضورؐ نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنہی کے درمیان گزاری تھی، اُس میں انہوں نے کبھی آپ کو جھوٹا یا فریب کار یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ حضورؐ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکہ کے لیے دراصل اُتنی زیادہ اُلجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے سب سے زیادہ اسی کا مذاق اُڑایا، اسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتارا جائے، کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیارِ اقدار بدل سکتا اور وہ دُنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکّہ معظّمہ کے ابتدائی دَور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جس سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں شبہات و اعتراضات

(حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ، البیضاء۔ لیبیا)

اسلامی نظامِ زندگی اور قانون کا خاتمہ سامراجی سازشوں سے تمام اسلامی ممالک میں سامراجی اور تبشیری (عیسائی مشنری) حکومتوں کے زیرِ سایہ ہوا تھا، اور سب سے پہلے جس اسلامی سوسائٹی میں اسلامی قانونِ حدود و تعزیرات کو ختم کیا گیا تھا بدقسمتی سے وہ سرزمین ہندوستان تھی"، انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی یعنی ۱۷۹۱ء تک ہندوستان میں قانونِ شریعت لاگو تھا۔ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً وضعی قوانین نافذ کرنے شروع کیے اور انیسویں صدی کے وسط تک قانونِ شریعت ختم کر دیا گیا۔ سامراجی حکومت کے زیرِ اثر مصر میں بھی ۱۸۸۳ء میں قانونی نظام فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا۔ بیسویں صدی میں البانیا اور ترکی نے پوری جرأت اور مسلمانوں کے ضمیر و خواہشات کی پروا کیے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ وہ دونوں لادینی حکومتیں ہیں اور سارے قوانین حتیٰ کہ پرسنل لا تک اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے قوانین کے ماتحت بنا دیئے[۱]"

یہاں اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں سامراجی حکمرانوں، یعنی انگریزوں، فرانسیسیوں اور اطالویوں کے طویل دورِ حکومت میں کبھی بھی مسلمانوں کے احوالِ شخصیہ سے تعرض نہیں کیا گیا۔ یعنی شریعت کے وہ اوامر جو اجتماعی زندگی میں شادی بیاہ، طلاق اور میراث وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جنہیں پرسنل لا کہا جاتا ہے، ان میں تبدیلی کی کوشش نہیں کی گئی، کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت تھی جس کے سمجھنے کے لیے کسی زبردست عقلی ریاضت کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قوانین وہ ہیں جن کا تعلق سوسائٹی کے ان سب افراد سے براہِ راست ہے جو کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس کا اثر حرام و حلال کی حدود کو چھوتا ہے۔

کیا یہ افسوس اور حرماں نصیبی کی آخری علامت نہیں ہے کہ غیر ملکی، سامراجی اور غیر مسلم حکومتیں تو علی الاقل اسلامی

---

[۱] مولانا مودودی کی عربی کتاب "نظریۃ الاسلام و ہدیہ" کے حاشیہ صفحہ ۱۲۸ - ۱۲۹ سے ماخوذ باختصار۔ یہ کتاب قانون اسلامی سے متعلق مولانا کے چھ مقالات پر مشتمل ہے۔ عربی ترجمہ "دار الفکر" بیروت و دمشق نے چھاپا ہے۔

عائلی قوانین میں کسی بھی تبدیلی کا آغاز نہ کریں بلکہ بعض حکمران مسلمان ملکوں میں خود شرعی عدالتوں کے ذریعہ سے اسلامی عائلی قانون کو اپنی زیر نگرانی نافذ کرائیں، مگر وطنی اسلامی حکومتوں میں مسلمان خدا کے بنائے ہوئے اس عظیم قانون میں تبدیلی اور تغیر کے نت نئے مطالبے کریں؟ اور بعض اوقات انتہائی جرأت مندی اور بے حیائی کے ساتھ اسے منسوخ کر دیں یا اس کے احکام کو بدل ڈالیں؟ اس موضوع کی تفصیل اس مقالے میں کرنی مقصود نہیں ہے، لیکن صرف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی نقطہ نظر سے قانون الٰہی کے جو ماخذ ہیں صرف انہی کی روشنی میں اسلامی قوانین بنائے جا سکتے ہیں، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو وہ عقلی، فطری اور شرعی تینوں قباحتوں کا حامل ہوگا، اور صحیح نہ ہوگا بلکہ عقل، فطرت اور شریعت پر ظلم عظیم کے مرادف بھی ہوگا، کیونکہ وہ فسق و ظلم و کفر کے تالوث کا آئینہ دار ہوگا۔

اس موقع پر بعض نادان اور بہت سے دانا حضرات دو سوال اٹھاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب اسلام کا قانونِ فوجداری اور دوسرے قوانین نافذ نہیں ہیں تو پھر پرسنل لا کے نفاذ پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ دوسرا یہ کہ دیکھیے فلاں اسلامی ملک میں فلاں اسلامی قانون بدل دیا گیا ہے یا اس کے بدلنے کی کوششیں جاری ہیں، اسی طرح ہم بھی اسلامی قوانین کو بدلنے کے کیوں مجاز نہیں ہیں؟

دانا حضرات کے لیے تو ان دونوں سوالات کے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اتنے بدیہی اور واضح ہیں کہ اس قسم کے معترضین ان کا جواب خود اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ نادان عوام کو اس طرح گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے ان کا مختصر جواب ہم بیان کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

۱۔ کیا اسلامی شریعت اور مکمل قوانین میں تبدیلی اسلامی عہدِ حکومت میں ہوئی تھی؟

۲۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کب، کیسے اور کن حالات کے ماتحت ہوئی تھی؟

۳۔ اگر سامراجی دور میں غیر ملکی اور غیر مسلم حکام نے یا ان کے حکم اور اشارے پر ملکی حکام نے یہ جسارت کی تھی اور حریت و انصاف اور شریعت الٰہیہ کا گلا گھونٹا تھا تو کیا ان کا یہ غیر آئینی، غیر فطری اور غیر اسلامی طریقہ کار ہمارے لیے نمونہ اور حجت بن سکتا ہے؟

۴۔ سامراجی طاقتیں جب اسلامی ممالک میں اپنا جسمانی اقتدار لے کر آئی تھیں تو ان کی مخالفت مسلمانوں نے اسلامی جذبہ کے ماتحت کی تھی، اور بہر حال جو بھی سیاسی حالات ہوں، آخر کار جب سامراجی حکومتیں فنا ہو گئیں اور اپنے جسمانی اقتدار کا پشتارہ اسلامی ممالک سے لے کر اپنے وطنوں کو واپس لوٹ گئیں تو عوام نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور کہا تھا کہ اب ہم آزاد ہیں اور سامراج کے غلام نہیں ہیں۔

۵- کیا یہ مسرت اور سامراج کی غلامی سے آزاد ہونے کی بشارت صرف اس لیے تھی کہ ظاہری طور پر سامراج ہمارے درمیان سے چلا جائے لیکن اس کا تہذیبی ورثہ، اس کے بنائے ہوئے قوانین کو ہم حجت اور نظیر کے طور پر پیش کریں؟ کیا یہ عقل سلیم کے ساتھ مذاق اور فطرت سلیمہ کے ساتھ مضحکہ نہیں ہے؟

۶- اگر سامراج کے بنائے ہوئے قوانین صحیح تھے تو پھر آزاد ملکوں کے وہ افراد جو آزادی کے بعد صدارت اور وزارت کے عہدوں پر براجمان ہوئے ہیں اور وطنی ہیرو اور قومی رہنما تسلیم کیے گئے ہیں ان کے لیے سامراجی حکومتوں اور قوانین نے جیل کی سزائیں تجویز کی تھیں، اور وطن کے غدار، حکومت کے دشمن، ملک کے باغی، فسادی اور اس قسم کی تمام تہمتیں ان کے حق میں روا رکھی تھیں۔

۷- سامراج کی بنائی ہوئی ریاستیں جب ختم ہو سکتی ہیں، سامراج کی بخشی ہوئی جاگیریں جب ضبط ہو سکتی ہیں، سامراج کے عطا کردہ القاب جب مٹائے جا سکتے ہیں، سامراج کی بنائی ہوئی سڑکوں پر سے سامراجی زبان میں لکھے ہوئے نام اور تختیاں جب کھرچی جا سکتی ہیں، سامراجی نمائندوں کے مجسمے پارکوں میں سے جب اتارے جا سکتے ہیں تو پھر آخر سامراج کا بخشا ہوا ملحدانہ اور لادینی نظام تعلیم و تربیت کسی تغیر کا محتاج کیوں نہیں ہے؟ اور سامراج کے بنائے ہوئے غیر صالح، غیر معقول اور غیر اسلامی قوانین ختم کرنے میں آخر کونسی عقلی و شرعی قباحت مانع ہے؟ اور اس کے بدلے صالح اور بین الاقوامی انسانی اور اسلامی قوانین اپنانے میں کونسا عقلی و شرعی عذر مسلم قوموں کے پاس اب موجود رہ گیا ہے؟ اور کیوں اسلامی ممالک میں مسلم علماء اور مسلم عوام کو یہ حق عطا نہیں کیا جاتا کہ وہ قانون مغربی کی جگہ کتاب و سنت یعنی شریعت اسلامیہ کے قانون کو رائج کریں جس کی پیروی، نگہبانی اور حفاظت ان پر فرض کی گئی ہے؟ اور کیوں نہ شریعت اسلامیہ کے خلاف بنائے گئے کسی بھی قانون کو عدالت میں چیلنج کرنے کا اختیار ہر مسلمان شخص کو دیا جائے، جس طرح اس کو اپنے دوسرے مالی و جانی حقوق کی حفاظت کے لیے یہ حق ملا ہوا ہے؟ مسلمان کے نزدیک اسلامی قانون اور شریعت کے احکام کی حفاظت اپنی جان، مال اور آبرو سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ یہ حکم شریعت نے اسے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" والی ساری قرآنی نصوص میں دیا ہے۔ رسول پاکؐ نے "من رایٰ منکم منکراً" والی حدیث میں ان پر یہ بات واجب کی ہے۔ اور خلفائے اسلام کی زرین تاریخ میں ہمیشہ ہر عامی شخص کو بھی یہ حق حاصل رہا ہے بلکہ ایک بوڑھی عورت تک کو اس بات کی مکمل آزادی اور ضمانت اور حق دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی قانون کی شرعی حیثیت سے متعلق استفسار کرے، بلکہ بھری محفل میں خلیفہ کے آرڈیننس کو چیلنج کرنے کی مجاز ہو، اور نص قرآنی سے اس کے استدلال اور شرعی پوزیشن واضح ہو جانے کے بعد خلیفہ وقت فوراً اس حکم کو واپس لے لے اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرے، اور اس طرح قیامت تک

آنے والی نئی نسلوں کو اسلامی قانون سازی کے اصول سکھا دے۔

۸۔ عجب طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ سامراج کے بنائے ہوئے سارے پلانوں میں تبدیلی تو روشن خیالی، قوم کی ضرورت، ملک کی ترقی اور وطنیت کا کمال سمجھا جائے، لیکن اسلامی قوانین میں سامراج نے جو تبدیلیاں کی تھیں ان کو بدلنے اور کالعدم کرنے کے بجائے ان کو سراہا جائے اور نظیر و حجت کے طور پر پیش کیا جائے۔

۹۔ بلکہ اس سے بھی عجیب تر ایک قدم آگے بڑھا کر پرسنل لا سے متعلق ان آئینی تبدیلیوں اور قانونی تغیرات کی کوششوں میں لگ جانا ہے جن میں ترمیم کی جرأت سامراج تک کو نہیں ہوئی تھی۔

۱۰۔ سامراج کے رخت سفر باندھنے کا تو تقاضا یہ تھا کہ اب اسلامی ممالک جلد از جلد قوانین الٰہیہ کو دوبارہ پوری آب و تاب کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کریں اور شریعت کے کلی اوامر و احکام پر اسلامی حکومتوں کی بنیاد ڈالیں، انحراف کی پالیسی کو ترک کریں اور زبان و دل سے قانون الٰہی کی سربلندی کی کوششوں میں لگ جائیں۔ لیکن یہاں گاڑی اُلٹی اسی رُخ پر جا رہی ہے جس پر وہ سامراج کے دور میں چل رہی تھی، بلکہ اس سے بھی آگے چلانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

۱۱۔ مسلمان اسے کہتے ہیں جو اسلام کو آخری، دائمی اور مکمل دین سمجھتا ہو، اور اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ پورے قانون اسلامی اور شریعت الٰہیہ پر ایمان رکھتا ہو، اور اس کے مکمل نفاذ کی کوششوں میں لگا ہوا ہو۔ جس شخص کے کلمۂ طیبہ کا تقاضا ہی یہ ہو کہ خدا کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی مالک، نہ کوئی رب ہے اور نہ کوئی آقا، اور انسان کے جسم و جان پر خالق و مالک و رب کے بنائے ہوئے قانون کے سوا کوئی دوسرا قانون نافذ ہی نہ ہونا چاہیے، اس شخص کا مقصدِ حیات ہی یہ ہوتا ہے کہ تمام جھوٹی خدائیوں اور طاغوتی فرماں روائیوں کے خلاف وہ علَم بغاوت بلند کرے اور قانونِ خداوندی کے سوا کسی دوسرے قانون پر راضی نہ ہو۔ کسی ایسے با مقصد فرد یا جماعت یا پوری اسلامی سوسائٹی سے یہ کہنا کہ چونکہ انگریزوں نے اسلامی کریمنل لا ختم کر دیا تھا اس لیے اب ہم اسلامی پرسنل لا بھی ختم کرنا چاہتے ہیں، دماغی کمزوری اور عقلی خلل کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ بات تو دراصل دلیل اس بات کی ہے کہ نہ صرف پرسنل لا کو باقی رکھا جائے بلکہ سامراجیوں نے جن جن شرعی قوانین کو منسوخ کیا تھا یا ان میں تبدیلیاں کی تھیں اسلامی ممالک میں انہیں فوراً اور بلا تاخیر نافذ کیا جائے، تاکہ سامراج کی قانونی و فکری بالادستی کا بھی اسی طرح خاتمہ ہو جس طرح سیاسی بالادستی کا خاتمہ ہوا۔

۱۲۔ مسلمان صرف سامراج کے بنائے ہوئے قوانین کا مخالف نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر طاغوتی نظام، ابلیسی قانون اور غیر اللہ کے طریق زندگی کا مخالف ہوتا ہے، چاہے اس کے کرنے والے اپنے ملک کے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ مسلمان کا مقام دُنیا میں حق کے گواہ کا مقام ہے۔ قومیت و وطنیت کے تنگ نائے میں پڑ کر حق و انصاف سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھنا۔

وہ خدا کے قانون کی سربلندی کے لیے کوشش کرتا ہے اور غیرالٰہی قوانین میں یہ تفریق نہیں کرتا کہ انہیں کوئی سامراجی حاکم نافذ کرتا ہے یا اپنے ہی ملک کا کوئی مسلمان نامی حاکم۔ وہ دونوں کے خلاف خدا کی رضامندی اور شریعت کی حفاظت و بقا کی خاطر نبرد آزما ہونے سے خوف نہیں کھاتا، اور اسلامی ملکوں میں وہ صرف قانونِ اسلامی کا نفاذ چاہتا ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعے سے اُمتِ اسلامیہ خدا کی رضا و رحمت کی مستحق بھی ہوگی اور قانونِ اسلامی کے صالح اور مفید عام تجربہ کو زندہ دیکھ کر ساری انسانیت اپنی دائمی پریشانیوں اور لاعلاج مشکلات کے لیے اس کی خدمات قبول کرے گی (جیسے کہ طلاق کے سلسلے میں ساری انسانیت نے کی)۔ مومن کا مقصدِ حیات اس دنیا میں خلافت کا قیام ہے، اور وہ دعوت الی اللہ کے ذریعے اور اسلامی قانون کی دائمی صلاحیت کے ذریعے پوری انسانیت کی جھولی اسلام کی لازوال دولت اور قانونِ شریعت کی باکمال نعمت سے مالا مال کرنا چاہتا ہے تاکہ بحر و بر میں رونما ہو جانے والے فساد اور سیلاب بلا کا خاتمہ ہو اور ظلمتِ انسانیت کی طویل شبِ فراق نورِ ایمان کی صبحِ وصال سے ہمکنار ہو۔

ایسے مومن و مسلم کے سامنے یہ بحث بالکل بے کار ہے کہ انگریزوں نے اسلامی کریمنل لا کو ختم کر دیا تھا اس لیے اب ہم پرسنل لا کو بھی ختم کر دیں۔

دوسرے سوال کی حقیقت بھی پہلے سوال کے جوابات کے ساتھ واضح ہو گئی، تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ:

۱۔ کسی نام نہاد اسلامی ملک میں اگر اسلام کے پرسنل لا سے متعلق کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ قانونی طور سے حجت نہیں، اور شرعی طور پر اگر کتاب و سنت کے خلاف ہے تو باطل اور کالعدم ہے، اس کی پیروی کسی دوسری اسلامی حکومت میں کیسے ہو سکتی ہے۔

۲۔ کیا یہ تبدیلیاں علمائے اسلام کی رائے اور مسلم عوام کے جذبات کے ماتحت رونما ہوئی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ مغرب زدہ حکومتوں کے اعلیٰ افسران کی اپنی من مانی ہے، اور کسی بھی شخص کی من مانی حرکات شریعت میں حجت کا درجہ نہیں رکھتیں۔

۳۔ بفرضِ محال عوام ہی کی مرضی اور رائے شماری اور ووٹنگ کے ذریعے بھی اگر کوئی تغیر و تبدل کیا گیا ہو، اور وہ کتاب و سنت کے خلاف ہو تو شریعت کی نظر میں کالعدم ہے۔

۴۔ یہ دعویٰ بھی گمراہ کن ہے کہ مسلمان ملکوں میں پرسنل لا تبدیل کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اسلامی ممالک میں پرسنل لا کے اندر کسی قسم کی بنیادی تبدیلی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ مغربی افکار کے دلدادوں کی طرف سے کوششیں ضرور شروع ہوئی ہیں، لیکن اکثر جگہ وہ ناکامی کی شکار ہوئی ہیں۔

۵- اکثر جگہوں پر حالات حاضرہ کے ساتھ جائز حد تک توافق کی صورتیں پیدا کرنے کی غرض سے فقہ اسلامی کے دوسرے مذاہب سے بھی مدد لی گئی ہے، اور کسی ایک فقہ تک قانون کو محصور نہیں رکھا گیا ہے[1]۔ مصری مقنن نے بھی یہی کیا ہے۔ پہلے اسلامی قانون کا ماخذ عام طور پر حنفی مذہب تھا، لیکن بعد میں اس اساس میں حالات وضروریات کے مطابق فقہائے امت کی آراء اور فقہی استنباطات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ لیبی مقنن بھی آج کل یہی کر رہا ہے۔ فقہ مالکی کو اساس بنا کر بوقت ضرورت کے مطابق دوسرے مذاہب وفقہی آراء سے استفادہ کیا جا رہا ہے، اور یہ طریقہ صحیح بھی ہے اور مناسب حال بھی۔ کیونکہ ساری دنیا پر محیط اور سارے مسلمانوں کے لیے قطعی طور پر قابلِ عمل اسلامی قانون میں تعصب، تنگ نظری اور مذہبی تفوق و پندار کی خو کا ہونا کوئی ایسی مستحسن بات بھی نہیں۔ لیکن ہاں فقیہ شہر اگر یہ چاہتا ہے اور اس پر راضی ہے کہ اسلامی قانون کے دائرے کو تنگ سے تنگ تر کرے تاکہ پھر مسائل کے حل کے لیے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے بجائے لاتینی، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور امریکی روشنداوں کی طرف دیکھنا پڑے تو اسے شوق سے مشق ستم کی اجازت ہے اور دعوت تعصب کو پروان چڑھانے کا موقع بھی میسر ہے۔

تمام مذاہب فقہ حق پر قائم ہیں اور حق کی قدریں ان میں مشترک ہیں، اہل سنت وفقہ کے اس قول میں صاف

---

[1] فقہی اصطلاح میں اس عمل کو "تلفیق" کہتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

"لَفَقَ الثوب الفقہ لفقا وھو ان تضم شقۃ الی اخری فتخیطھما، ولفق الشقتین یلفقھما لفقا، ولفّقتھما ضم احداھما الی الاخری فخاطھما" (لسان العرب- ۱۲-۲۰۶) ترجمہ: "کپڑے کو لفق کیا یعنی ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے سے ملا کر سی دیا، اور دو ٹکڑوں کو لفق کیا یعنی دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور پھر سی لیا"۔ فقہی تلفیق کے معنی بھی اصلی اور لغوی معنی ہی کے قریب ہیں یعنی دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کو ملانا۔ کیونکہ کپڑے کے دو ٹکڑوں کو بھی ضرورت کے وقت ہی ملا کر سیا جاتا ہے، بلاضرورت یہ کام نہیں کیا جاتا۔ احادیث ملفقہ عام طور پر احادیث کاذبہ کو کہا جاتا ہے، اور یہ بھی لغوی معنی ہی سے ماخوذ ہے، کیونکہ واضع حدیث سچ بات میں یا تو کچھ جھوٹ ملا دیتا ہے یا بات اپنے من کی بیان کرتا ہے لیکن اس کی نسبت حضور نامدار کی طرف کر کے اس میں جھوٹ کی آمیزش کر دیتا ہے۔ لفق کے اصل معنی جھوٹ یا کذب کے نہیں بلکہ ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے کے ہیں۔ اگر یہ آمیزش ایک صحیح چیز میں صحیح چیز کی ہے تو تلفیق ہے اور اگر یہ ملاوٹ غلط چیز کی ہے تو کذب کے معنی اپنے اندر رکھتی ہے۔

اور واضح اجازت اس بات کی ہے کہ سارے مذاہب سے استفادہ کیا جانا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضرورت کے وقت مستحسن اور ضروری ہے، اور کسی غیر اسلامی قانون سے اخذ کرنے کی صورت میں تو واجب اور فرض ہو جاتا ہے۔

یہاں تک تو مسئلہ کا پہلو بہت اچھا ہے لیکن اس سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے

(الف) ایک تو یہ کہ عام قانون کی بنیاد کسی ایک فقہی مذہب پر قائم کی جائے، اور ملک کے عام فقہی مذہب کی رعایت رکھی جائے تاکہ عوام میں بے دلی اور عدم اطاعت کے جذبات نہ ابھریں۔

(ب) یہ اس صورت میں اور اس وقت تک کے لیے ضروری ہے جب تک کہ ممالک اسلامیہ میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہیں۔ جب خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے اور پورے عالم اسلامی میں ایک خلیفہ کا حکم نافذ ہو جائے اور ایک حکومت بن جائے تو اس وقت خلیفہ وقت تمام علمائے امت کے اجتماع کے ذریعے فقہائے امت کے اقوال و مذاہب اور اجتہاد و استنباط کے شرعی طریقوں سے مکمل اسلامی قانون بنانے کا مجاز ہوگا، اور کسی ایک مذہب فقہ کو بنیاد بنانے والی شرط اس صورت میں ختم کی جا سکتی ہے۔

(ج) عام حالات میں محض آسانیاں اور سہولتیں تلاش کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں اقوال کو اخذ کیا جائے۔

(د) شدید ضرورت کے وقت یا خصوصی حالات و مسائل میں آسانی کی خاطر بھی کسی مسئلہ کو قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ متروک اور بالکل بے دلیل نہ ہو، اور مقصود اصلاح ہو، اور اسلامی نقطہ نظر کام کر رہا ہو اور اخلاص ہو، کسی مشرقی یا مغربی نقطہ نظر کی وجہ سے توڑ مروڑ کر یا غیر سائغ فی الشرع (شریعت میں غیر مقبول) تاویلات کے ذریعے نہ ہو۔

(ر) سب سے اہم اور سب سے ضروری شرط جس کے بغیر کسی قسم کی تلفیق، استنباط، قیاس اور اجتہاد نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ کہ یہ کام علماء و مفکرین اسلام کی اجتماعی آراء سے ہو، اور کسی ایک ملک کے علمائے کرام کا اجماع یا امت اسلامیہ کے علماء کا اجماع کسی مسئلہ پر اگر ہو جائے تو پھر وہ کسی بھی مذہب فقہ سے لیا جا سکتا ہے۔ اجماع کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی غیر شرعی چیز پر اجماع اس کو شرعی بنا سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ مسئلہ یا تو پہلے سے کسی مذہب فقہی میں جائز ہو، یا پھر نئے مسائل میں استنباط مسائل کے شرعی طریقے استعمال کیے جائیں جنہیں فقہاء و علمائے امت ہر ملک میں جانتے ہیں۔ نیز اجماع کا لفظ یہاں میں نے بمعنی اجتماع بھی لیا ہے، یعنی علمائے امت کی اکثریت اس کو قبول کرے۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو دوسرے مذہب فقہ میں سے اخذ کرنے کے بعد قانون میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہرگز صحیح

نہیں ہو سکتا کہ اجتہاد کی شرطوں، عربی زبان کی باریکیوں اور بلاغتوں اور فقہ اسلامی کے مذاہب سے بے خبری کے ساتھ ساتھ ہر عامی شخص کو اس طرح کی اجازت دے دی جائے اور جس کا جو جی چاہے وہ عمل شروع کر دے۔ یقیناً یہ شریعت پر ظلم کے مُرادف ہوگا، کیونکہ یہاں تو ہم قانونی معاملات پر گفتگو کر رہے ہیں، عبادات اور ان اشیا تک میں جن کا تعلق خدا اور بندے کے درمیان ہے ان میں بھی عوام کو تقلید ہی کا حکم ہے، صرف مجتہد کو امام اعظم کے نزدیک اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو تقلیدِ مجتہد کرے اور چاہے تو اپنے اجتہاد پر عمل کرے، اور امام شافعی نے عامی پر تقلید اور مجتہد پر اپنے اجتہاد کے موافق عمل واجب کیا ہے[۱] اس لیے قانونی اشیا میں عوام کو اختیار اور پسند کا حق نہیں دیا جا سکتا، اور اسی طرح علما کی موافقت یا مجتہدین کے اتفاق سے اگر کوئی چیز قانون میں درج کر دی گئی تو پھر مجتہد کو بھی اس کے خلاف عمل کرنا درست نہیں، کیونکہ اسلام میں افتا و قضا کا منصب موجودہ دور میں قانون اور کورٹ کے منصب سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور جس طرح قانون کے صدور کے بعد اشخاص کو چاہے وہ عوام ہوں یا خواص، علمائے قانون ہوں یا وکیل اور جج ہوں قانونی معاملات میں اپنی آرا و افکار کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا، بلکہ سب قانون کے پابند ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح علما و مفکرین اسلام کے اجماع یا شبہِ اجماع یا اکثریت سے کسی بھی جائز مسئلہ کو مان لینے کے بعد اس مسئلہ کو ماننا تمام امت پر واجب ہوگا۔

(ز) کوئی صاحب یہ اعتراض نہ کریں کہ علمائے اسلام کا اجماع کسی معاملے میں ہو ہی نہیں پاتا، کیونکہ قانونی اور فقہی چیزوں میں اختلاف علم و تفقہ کی دلیل بھی ہے اور تفکیر انسانی کا شاہکار بھی۔ اسلامی شریعت کے علاوہ بھی دُنیا میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں جس میں کسی نہ کسی قانون دان، وکیل یا جج کو اختلاف نہ ہو۔ اس لیے اختلافات کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں اور نہ یہ اسلامی قانون کے اجرا میں تعویق کا سبب بن سکتے ہیں، کیونکہ علمائے اُمت کا اصولی طور پر متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو، اور پھر قانونی طور پر اختلافات فقہیہ کے باوجود علمائے حق کی اکثریت کا کیا ہوا فیصلہ قانونی مسائل میں نافذ ہو سکتا ہے، اور جمہوریت کے اس دور میں علمائے حق میں سے اکثریت کی رائے معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، یہ فیصلہ قانونی اشیا ہی میں ضروری بھی ہے۔

(س) اگر دوسرے مذاہب فقہ کے باشندے ملک میں موجود ہوں اور ان کے علما کی اکثریت دوسرے مذاہب فقہ سے تلفیق کے حق میں نہ ہو تو گو بظاہر یہ انتہائی افسوسناک بات ہوگی لیکن مذہبی حریت اور فکری آزادی کی خاطر یہ

---

(۱) قواعد الاحکام فی مصالح الانام، لعبدالعزیز بن عبدالسلام جزء ۲ - صفحہ ۱۶۰

بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب فقہ کے ماننے اور چاہنے والے کے لیے قانونی اعتبار سے فیصلے اسی کی فقہ کے مطابق ہوں۔ ایسا کرنے میں نہ کوئی عقلی قباحت ہے اور نہ کوئی شرعی مانع۔ میرے نزدیک پہلی صورت مستحسن ہے اور اسلامی وحدت کی رُو سے بھی اچھی ہے لیکن حُریت کے تقاضوں کے پیش نظر اس دوسری چیز کے ماننے میں بھی مجھے ہرگز انکار نہیں۔ لیکن قانون میں پھر یہ تصریح بے حد ضروری ہوگی کہ کوئی بھی وہ گروہ جو صرف اپنی فقہ کی روشنی میں فیصلہ چاہے گا، اسے کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے کسی دوسرے مکتب فقہ سے اخذ کرنے کی مطلق اجازت نہ ہوگی اور اس کے سارے فیصلے اسی مذہب کے اقوال کی روشنی میں حل کیے جائیں گے چاہے ان میں کتنی ہی مشکل اور سختی ہو۔

۱۰۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی وطنی حکومتوں کے لیے بھی اپنی جمہوریت کے تولنے کا وقت اور امتحان ہے کہ غیر وطنی اور سامراجی حکومتیں جب مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کر سکیں تو آئینِ جہانبانی اور دستورِ فطرت کے مطابق ہر عقیدے اور مذہب والے کو اس کے عقیدے اور اعمال میں جو حُریت کی ضمانت دی گئی ہے وہ وطنی حکومتیں اس طرح پُوری کر سکتی ہیں کہ سامراجی عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے غصب کیے ہوئے حقوق واپس کریں اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتیں تو کم از کم ان حقوق اور قوانین ہی کو باقی رہنے دیں جنہیں غیر وطنی حکومت نے باقی رکھا تھا، اور خصوصی طور پر اسلامی عائلی قوانین کیونکہ یوں تو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ پر اٹل اور مستحکم ہے، لیکن بعض قوانین وہ ہیں جو مسلمانوں کے اقتدار اور اسلامی حکومت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، جیسے قصاص، حدود، اسلامی تعزیرات وغیرہ۔ اور بعض دوسرے قوانین وہ ہیں جو ہر خطۂ زمین پر جہاں مسلمان آباد ہیں وہ نافذ ہو سکتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے، چاہے مسلمان غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہوں یا اقلیت میں ہوں یا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ میں رہتے ہوں۔ جیسے عبادات، اخلاقیات اور وہ اجتماعی و عائلی قوانین جن کی رُو سے حرام و حلال کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مذہب کا پیرو کسی بھی وضعی قانون کی رو سے حلال یا حرام کی ہوئی کسی چیز کو اپنا لے یا چھوڑ دے۔ کیونکہ مذہب ہی کی حلال کی ہوئی چیزیں اس کے نزدیک حلال ہیں اور مذہب کی حرام کردہ اشیا ہی اس کے نزدیک حرام ہیں۔ اس کا وجدان و ضمیر اور قلب و نظر اس کے علاوہ کسی دوسری بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اور قانونی طور پر اگر اس کو منوا بھی لیا جائے تو شرعی طور پر گویا وہ ایک حرام کام کا مرتکب ہوگا۔ مثال کے طور پر وضعی قانون، میراث میں سے کسی کو ایک حق دلاتا ہے، لیکن شرعی طور پر اس کا حصہ کم ہے یا وہ سرے سے وارث ہی نہیں ہے۔ تو یہ مال اُس شخص کے لیے حرام ہوگا، اور حرام مال کھانے والے کا پیٹ آگ کا ایندھن بنے گا۔ دوسری مثال یہ کہ طلاق اسلامی طریقہ ہے، اگر قانون کسی مطلقہ جوڑے کے لیے یہ فیصلہ کرے کہ تمہاری طلاق نہیں ہوئی ہے، لیکن شریعت کا فیصلہ یہ ہو کہ ہو گئی ہے تو اب دونوں میاں بیوی فحش کاری اور زنا کے مرتکب ہوں گے، اور اصرار کے

ساتھ یہ عمل کرنے اور توبہ کی طرف رجوع نہ ہونے کی صورت میں زناکار خدا کی لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔ اس لیے اسلام کا عائلی قانون صرف اجتماعی اور سوشل قانون ہی نہیں بلکہ عقائد و عبادات کا ایک جزو ہے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں گناہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی آزاد ملک میں رہنے والا مسلمان شخص یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ حکومت چاہے وہ اسلامی ہو یا سیکولر، اس کے عقائد و عبادات، قلب و وجدان، ضمیر و باطن اور حرام و حلال کے معاملات میں دخل اندازی کرے؟

۷۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان پر کسی نام نہاد اسلامی ملک کی قانونی بدعات کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں قانون سازی اسلام میں صرف خدا کا حق ہے اور انسان کتاب و سنت و اجماع کی روشنی میں خدا کے احکام کا استنباط کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے ماخذوں میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ کسی اسلامی حاکم یا اسلامی ملک کا غیر اسلامی قانون بھی مسلمانوں کے لیے حجت بن سکتا ہے، بلکہ اس کے بالمقابل صاف صاف یہ اعلان ہے کہ "خدا کی معصیت میں کسی انسان کی اطاعت جائز ہی نہیں ہے"۔ اقلیت میں بسنے والے مسلمانوں کے پاس بھی کتاب و سنت موجود ہے، وہاں بھی علماء و فقہاء پائے جاتے ہیں، اور وہ براہ راست ایسے احکام کا استنباط شریعت کے اصولوں کی روشنی میں کر سکتے ہیں جو مشکلات حیات پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں۔

۸۔ مسلمان اقلیت کے لیے یہ حجت بھی بالکل غیر شرعی ہے کہ ملک کی غیر مسلم اکثریت نے اپنا مذہبی عائلی قانون بدل کر اس کی جگہ وضعی قانون شادی بیاہ اور میراث وغیرہ قبول کر لیا ہے، اس لیے اس ملک کی مسلم اقلیت کو بھی اسے قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اکثریت اپنا مذہب چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کے معاملہ میں آزاد ہے، اس کا جو جی چاہے کرے۔ لیکن اقلیت کے حقوق کو چھیننے کا وہ حق نہیں رکھتی۔ دوسری بات یہ کہ شاید اکثریت کے مذہب اور اس کے بانیوں اور مقننوں نے اس کی اجازت اپنے پیروؤں کو دی ہو کہ تم اپنے قانون عائلی میں تبدیلی کر سکتے ہو، لیکن شرع اسلام نے صاف صاف یہ حکم دیا ہے کہ یہ حدود اللہ ہیں، ان سے آگے نہ بڑھنا اور کسی قسم کی غیر شرعی تبدیلی کے مجاز ہی تم نہیں ہو۔ اس لیے کسی انسانی قانون ساز کو کبھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کو بدلے۔ تیسری عقلی بات یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین مسلمان کی نظر میں سارے وضعی قوانین سے بہتر ہیں اور عدل و عدالت دونوں اپنے اندر رکھتے ہیں (یعنی کسی ایک خاص شخص کے کیس میں بھی انصاف کرتے ہیں اور عام فطری اصولوں کی رو سے ہر ہر پیش آنے والے قضیے میں بھی حق و انصاف کی رعایت کرتے ہیں)، اور اس طرح زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ کسی غیر مسلم کی نظر میں یہ قوانین نعوذ باللہ ظالمانہ ہوں یا زمانے کا ساتھ دینے

کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو قطع نظر اس کے کہ بات عقل و منطق، تاریخ و تجربہ کے خلاف ہے، پھر بھی ہم یہ کہیں گے کہ سوسائٹی میں بہت سے دوسرے ظالمانہ مسائل موجود ہیں۔ آپ براہ مہربانی ان کی طرف توجہ دیں، اور ہمارے مسائل کو ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ کیونکہ جب امت اسلامیہ ان مفروضہ تقصانات کو بخوشی و لی برداشت کرنے کے لیے راضی ہے تو پھر یہ پُرانی مثل صادق آتی ہے کہ جب میاں بیوی راضی تو پھر کیا کریں قاضی۔

۹۔ قوانین اسلامیہ کے سلسلے میں کتاب و سنت سے اجتہاد کے لیے علمائے امت ہی کی رائے وقیع ہو سکتی ہے۔ جبری احکام یا جلسوں، جلوسوں اور ووٹنگ کے ذریعے اس قسم کی قانونی باتیں طے نہیں ہو سکتیں۔ اگر کسی ملک کے چور یا رشوت خور یا بلیک مارکٹنگ کے دلدادہ اور اخلاق باختگی پر فریفتہ دیوانے کسی شہر میں جلسہ کریں اور ووٹنگ سے یہ پاس کرا دیں کہ یہ اخلاقی اور قانونی بُرائیاں، بُرائیاں نہیں بلکہ اچھائیاں ہیں، اور عیب نہیں بلکہ ہنر ہیں، تو کیا مقنن ان کی ہرزہ سرائی کو برداشت کرے گا؟ اور اگر کسی دوسرے ملک یا قانون سے یہ حجت بھی پیش کر دیں کہ وہاں بلیک کی عام اجازت ہے۔ ! فلاں بابلی قانون میں اور فلاں ماڈرن سوسائٹی میں کنوارپن اور عفت و عصمت عیب سمجھے جاتے ہیں، اور حرام کاری، بےحیائی اور عیاشی ہنر اور فیشن ہے، تو کیا یہ بات کسی دوسرے اخلاق و ایمان سے آشنا ملک کے مقنن کے لیے نظیر کا کام دے سکتی ہے؟

۱۰۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی تقلید ہی کرنا چاہتی ہیں تو اچھی باتوں میں کرنی چاہیے، مثال کے طور پر اکثر اسلامی ملکوں میں پرسنل لا میں مطلق تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اور بعض ملکوں میں شریعت کے پورے قوانین نافذ ہیں جن میں دیوانی و فوجداری سب شامل ہیں، اور بعض ممالک میں شریعت اسلامیہ کے مطابق سارے قوانین ڈھالنے کے اعلان ہو چکے ہیں اور کہیں اسکیمیں تیار ہیں۔ یا مثلاً مسلم ملکوں میں یہودی اور مسیحی اور دوسری اقلیتوں کا پرسنل لا اب تک محفوظ ہے اور کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم اس میں نہیں کی گئی ہے[ل]۔ اس لیے وہ جمہوری ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں اسلامی ممالک کے اس عظیم قانونی، اخلاقی برتاؤ کی روشنی میں سوچنا چاہیے جو وہ اپنی محکوم اقلیتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یا پھر ہندوستان کی ساڑھے آٹھ سو سالہ تاریخ قانون پر نظر رکھی جا سکتی ہے جس میں کہیں بھی غیر مسلموں کے پرسنل اور عائلی قوانین، حتیٰ کہ عادات و رسوم تک کو ہاتھ نہ لگایا گیا تھا۔ اسی طرح عباسی، اُموی اور اندلس کی تاریخ قانون

ل۔ راقم انشاء اللہ اس سلسلے میں دو مضمون پیش کرے گا جن کا عنوان ہوگا "غیر مسلموں کے پرسنل لا کا تحفظ اسلامی تاریخ میں"۔ ایک میں مصر کی قدیم تاریخ سے یہودیوں کے شعائر ذبح کی آزادی کا قصہ بیان کیا جائے گا، اور دوسرے میں عصر حاضر میں مسیحیوں کی طلاق سے متعلق تفصیل پیش کی جائے گی۔

سے بھی یہ چیزیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔

۱۱۔ کیا ترکی کے لیے یہ بات افسوس اور محرومی کی نہیں ہے کہ شریعت میں جو تبدیلیاں سامراجی اور مسیحی حکومتیں نہ کر سکیں وہ اس نے کیں، اور جس ترکی نے چھ سو برس تک اسلامی اقتدار کی حفاظت کی تھی وہی آج ان اقدار کو توڑنے والا بن گیا؟ اور کیا یہ شرم و عار کا مقام نہیں کہ خود ترکوں کے بنائے ہوئے عائلی قوانین یہودی ملک اسرائیل اور مسیحی ملک لبنان کے مسلم باشندوں پر اب بھی نافذ ہیں، مگر جدید ترکی کی مسلم سوسائٹی ان سے محروم کر دی گئی ہے؟ سیکولر ہندوستان میں بھی انگریزوں کے زمانے کا مسلم پرسنل لا آج بھی نافذ اور جاری ہے؟ مگر بعض اسلامی ملک ان قوانین کی تبدیلی کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں؟ اور کیا سب سے بڑھ کر ستم یہ نہیں کہ ان نام نہاد اسلامی حکومتوں کے اقوال و اعمال و کردار کو حجت بنا کر اس کی روشنی میں مسلم اقلیتوں کے اسلامی پرسنل لا میں تبدیلی کی باتیں غیر اسلامی ممالک میں سوچی جاتی ہیں اور ان کو حجت بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور اس طرح اقلیتوں کے محافظ، غم گسار اور سہارا بننے کے بجائے مسلم حکومتیں اور ان کے اعمال اقلیتوں کی محرومی اور دل شکنی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ (یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ان کے اعمال اور غیر اسلامی قوانین کسی کے لیے بھی حجت نہیں بن سکتے)۔

۱۲۔ تمام غیر مسلم اور قدیم ترین اپنا رشتہ اپنے ماضی سے اور اپنے ناقابلِ عمل قانونی ورثہ سے جوڑنا چاہتی ہیں اور اسے فخر سمجھتی ہیں، اور عصر حاضر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں اس میں طرح طرح کی تاویلات کرتی ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ پاپڑ بیلتی ہیں۔ کیا مسلم اقوام کی بیداری کا وقت اب بھی نہیں آیا ہے؟

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (حدید - ۱۶)	"کیا ایمان والوں کے لیے (اب بھی وہ) وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی سے خشوع حاصل کریں، اور اس سے جو (دین) حق (خدا کی طرف سے) نازل ہوا"؟

کیا انہیں اپنے قدیم اور دائمی آسمانی حقائق سے آگاہی نہیں حاصل کرنی چاہیے؟ کیا انہیں اپنے تہذیبی ورثہ کی طرف نہیں لوٹنا چاہیے؟ دنیا میں پیدا شدہ مشاکل کا ازلی حل اور ابدی علاج جس اسلامی قانون میں موجود ہے کیا اس کو مکمل طور سے اپنانے کی سعی اخلاص و ایمان کے ساتھ انہیں نہیں کرنی چاہیے؟ اور اس طرح الجھنوں میں گھری ہوئی انسانیت کو مشکلات کے حل کرنے کا فطری طریقہ انہیں نہیں سکھانا چاہیے؟ اور کیا خدا کے بخشے ہوئے نور اور سلامتی کی راہ کا چارہ پر انہیں اقوامِ عالم کی حیرانیوں، اور گم کردہ راہ پگڈنڈیوں کے سامنے نہیں کرنا چاہیے؟ اور اقوامِ عالم کے لیے خدا کی

دی ہوئی اس ندا سے ان کے گوش آشنا نہیں کرنے چاہییں کہ :

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(مائدہ، ۱۵-۱۶)

"تحقیق آ گیا تمہارے پاس (تمہارے) اللہ کی طرف سے نور اور روشن و واضح کتاب، اس کے ذریعے اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو اس کی رضا کا تابع ہو، سلامتی کی راہوں کی، اور نکالتا ہے ان کو (زندگی کے) اندھیروں میں سے روشنی کی طرف، اپنے حکم سے، اور انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔"

بہر حال مختصر سے اس مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ دونوں سوالوں کا جواب دے دیا ہے۔ آخر میں اختصار کے ساتھ اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں سوال فطری، عقلی، بدیہی اور قانونی و شرعی کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص اور قوم کا غیر آئینی عمل کسی بھی دوسرے شخص یا قوم کے لیے آئینی حجت نہیں بن سکتا، بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص کے پیٹ میں اگر درد ہو تو یہ اس بات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے سر میں بھی درد پیدا کیا جائے، یا اگر کسی ایکسیڈنٹ میں یا کسی ظالم و جابر غیر ملکی فرماں روا کے تشدد کی وجہ سے کسی شخص کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے تو اس کو اس بات کی سند نہیں بنایا جا سکتا کہ ضرور اس کی دوسری آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضا بھی تلف کیے جائیں۔ اس طرح کی منطق نہ صرف یہ کہ نادانی اور لاعلمی سے تعبیر کی جائے گی بلکہ شاید کوئی بھی صحیح الدماغ انسان اس قسم کی ہرزہ سرائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ صرف یہی کہے گا کہ فوراً آپریشن کے ذریعے اس کی آنکھ ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور اگر خدانخواستہ وہ ٹھیک نہ ہو سکے تو اس کی دوسری آنکھ کی مکمل نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کی جائے کہ کہیں اس کو مزید نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ بات عقلی طور پر کتنی ناقابلِ تسلیم اور مضحکہ خیز ہے کہ اگر کسی چور یا غاصب نے آپ کی گھڑی چرا لی ہے یا غیر قانونی طور پر آپ کی زمین ضبط کر لی ہے تو کوئی دوسرا ساہوکار یا ہمدرد ملک کے قانون ساز ادارے یا عدالت سے یہ مطالبہ کرے کہ ان کے گھر کا سارا سامان چرا لے جاتے اور ان کے سارے مکانات، دکانیں اور زمینیں بھی ضبط کرنے کا قانونی حق عطا کیا جائے۔ یا یہ بات کس قدر عبرت ناک حد تک نادانی ہوگی کہ کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کر دے کہ چونکہ ظالم و غاصب سامراج کی قانونی عدالت یا غیر قانونی حکومت نے فلاں ملک کے موجودہ فلاں وزیر اعظم یا قومی رہنماؤں کے خلاف جیل کی سزائیں دی تھیں اور ان میں سے کسی نے سولہ برس، کسی نے سولہ مہینے اور کسی نے سولہ دن ہی ہی جیل کی مشقتیں

برداشت کی تھیں، اس لیے اب سامراج کے چلے جانے کے بعد ان سارے پرانے قومی رہنماؤں تک کو جیل دی جائے جن کو سامراجی حکومت نے جیل کی سزا نہیں دی تھی اور دوسری طرف وہ رہنما جن کو سامراج کی عدالتوں نے سزائیں دی تھیں ان کو آزادی کے بعد بھی وزارت و امارت کی کرسیوں سے ہٹا کر دوبارہ جیل کی کوٹھریوں میں فوراً بند کر دیا جائے۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ نادانی سے تعبیر کی جائیں گی بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہے تو اسے ڈاکٹری معائنہ کے بعد یا تو پاگل خانے بھجوا دیا جائے گا یا پھر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور جیل بھجوا دیا جائے گا۔

لیکن طرفہ تماشا یا ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اسلامیات یا پرسنل لا کے سلسلے میں اس قسم کی باتیں کرنے کا نام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلمندی، روشن خیالی، دانائی، فیشن، ہنر، ریسرچ اور علم و تحقیق پڑ گیا ہے۔ بہر حال اس قسم کی غیر آئینی، غیر علمی، غیر عقلی، غیر فطری اور غیر شرعی باتیں کرنے والوں کے حق میں بھی ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اے فیاض ازل حکمت و شعور اور عقل و دانائی کی دولت انہیں نصیب فرما۔ اور قانون اسلامی کی خوبیوں کو سمجھنے کی بصیرت ان میں پیدا فرما، اور حقیقی اسلام کی چاشنی سے ان کے کام و دہن آشنا بنا تاکہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہوئے اسلام کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ تیرے دین کے سچے خدمت گزار بن جائیں۔ اور غیر اللہ اور طاغوت کی قانونی بالادستی کے بھی منکر ہو جائیں، اور ان کے دلوں سے مغربی و مشرقی غیر اسلامی افکار، اقدار اور تہذیب کی محبت بھی نکل جائے کہ اسلامی قانون کے برتنے کار لانے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اسلام کے سیل رواں اور اسلام کی روشنی کے سامنے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، اور اب وہ وقت قریب آچکا ہے جب اسلامی ملکوں میں اسلام کا شمس تاباں پوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے، اور باطل کے سارے گھروندے خس و خاشاک بن کر بہہ جائیں گے یا خاکستر ہو جائیں گے کیونکہ ان کی حقیقت مکڑی کے جالوں سے زیادہ نہیں ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ	ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے سوا اولیا (محبوب، مددگار،
كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَاِنَّ	شریک، حمایتی) دوسروں کو بناتے ہیں، ان کی مثال مکڑی
اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا	کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور سب سے
يَعْلَمُوْنَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ	کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ سمجھتے۔ اللہ جانتا ہے
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	جس کو پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز بھی، اور وہ
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ	زبردست حکمتوں والا ہے، اور یہ مثالیں (اور کہاوتیں) ہم لوگوں کے
اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۔ (عنکبوت۔ ۴۱۔ ۴۳)	(فائدے) کے لیے بیان کرتے ہیں، اور ان کو سمجھتے (یہ سمجھے) وہی ہیں
	جو جاننے والے (سمجھ دار) ہیں۔

تحریک اسلامی کا کارکن

(سیّد اسعد گیلانی)

تحریک اسلامی اللہ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی کو غالب و نافذ کرنے کے لیے پورے دینِ اسلام کو ایک مشن قرار دیتی اور اسے ایک عملی جدوجہد کی صورت میں لے کر اُٹھتی ہے۔ ایسی تحریک کے ساتھ کارکن کی حیثیت سے صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اسلام پر دل سے ایمان رکھتے ہوں اور اسے غالب و نافذ کرنے کا مخلصانہ جذبہ اور داعیہ بھی رکھتے ہوں۔

اسلام کو غالب کرنے کا جذبہ و داعیہ ہر مسلمان میں ہو سکتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، عالم ہو یا طالبِ علم، تاجر ہو یا ملازم، آزاد ہو یا غلام۔ بہرحال جس سینے میں بھی دینِ اسلام کی تڑپ ہو گی وہ ضرور دین کی سربلندی کی خاطر سپر ہو جانے کے لیے بیتاب ہو گا۔ اور وہ عمر کے جس دَور، یا زندگی کے جس دائرے میں بھی ہو گا، ضرور ہی اپنے مالک کے دیے ہوئے ہدایت نامے اور اپنے قبول کیے ہوئے دین کی اقامت کی خاطر تن من دھن سے اپنی استطاعت کی حد تک تگ و دو کرے گا۔ چنانچہ تحریک اسلامی کا کارکن وہی ہوتا ہے جو اسلام کے غلبے کے لیے کام کرے اور تحریک کے ساتھ مل کر کام کرے۔ جس مسلمان کے اندر یہ خوبیاں پائی جائیں وہ تحریک اسلامی کا کارکن ہی شمار ہو گا۔ چاہے وہ اپنے اس فرض کو مسجد میں خطبہ دے کر ادا کرے یا کسی درسگاہ میں طالب علموں یا اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنے معیاری کردار سے اسلام کی نمائندگی کر کے ادا کرے۔ ہر صورت میں یہ کام اسلام کی خدمت ہی ہو گا، ان کوششوں کا تیر ایک ہی سمت میں جائیگا اور اقامتِ دین کی منزل کے ایک ہی نشانے پر لگے گا۔

تحریک اسلامی کا کارکن باطل کے بگاڑے ہوئے ماحول میں بڑی نمایاں شخصیت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر وہ خوب جانا پہچانا اور شناخت کیا جاتا ہے، جس طرح کوئلوں کے ڈھیر میں روئی کا گالا پڑا ہوا صاف دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اسے دُور سے پہچان لیتے ہیں اور دیکھ کر ہی بتا دیتے ہیں کہ وہ جا رہا ہے تحریک اسلامی کا کارکن۔ اسے اپنے نام و مقام کا تعارف کرانے کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن اپنے مسلک و مشن کا تعارف کرانے کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تحریک نے اگر معاشرے میں کچھ کام کر رکھا ہے اور لوگ تحریک کی علاماتِ شناخت سے روشناس ہیں تو پھر موافق و مخالف لوگ تحریک کے کارکن

کو بہت اچھی طرح شناخت کرتے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی تحریک اسلامی نظر آجاتی ہے اور اس کے بولتے ہی تحریک اسلامی بول پڑتی ہے۔

ایک میں تین شخصیتیں تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن میں تین شخصیتیں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ مُسلم، مُبلّغ اور مجاہد کی صفاتی شخصیتیں۔

مُسلم وہ قول و فعل میں اُسی اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے جس کا وہ علمبردار ہے۔ اس کے لیے بس اتنا جان لینا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کے خدا کا اس کے لیے کیا حکم ہے اور اس کے رسولؐ نے اسے کیا ہدایت دی ہے۔ بس اس کے بعد اس کے لیے اطاعت میں چون وچرا کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ وہ کُھلے دل و دماغ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا تابعِ فرمان ہوتا ہے۔ اسے جھکانے کے لیے بس اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ یہاں اللہ اور اس کے رسولؐ نے جھک جانے کا حکم دیا ہے، اور اسے کھڑا کر دینے کے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہوتا ہے کہ وہاں خدا اور اس کے رسولؐ نے کھڑا رہنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اُن کے حکم کا بندہ، اُن کا مطیعِ فرمان، اور اُن کے اشارے پر جان قربان کر دینے کا داعیہ اور حوصلہ رکھنے والا مستعد غلام ہوتا ہے۔ مسلم کی حیثیت سے کامل مطیع فرمان ہونے کی کیفیت تحریک اسلامی کے کارکن میں مختلف مدارج میں پائی جاتی ہے اور جس کارکن میں جس درجے میں یہ صفت پائی جاتی ہے اسی درجے میں وہ تحریک اسلامی کا اعلیٰ یا ادنیٰ کارکن ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ پورے فہم و شعور کے ساتھ اسلام کو زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہوتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں ایک نظریے کا علمبردار اور شعوری مسلمان ہوتا ہے۔

مُبلّغ اس کے کردار میں دوسری شخصیت ایک مُبلّغ کی ہوتی ہے جو ہمہ وقت اور ہمہ پہلو گفتار و کردار سے تبلیغِ دین کا کام کرتا رہتا ہے۔ تبلیغِ دین کے لیے اس کے اوقات مقرر نہیں ہوتے۔ کوئی خاص مقامات متعین نہیں ہوتے۔ کچھ خاص افراد ہی قابلِ تبلیغ نہیں ہوتے۔ بلکہ موقع و محل اور حکمت و ضرورت کا اہتمام کرتے ہوئے تحریک اسلامی کا کارکن ایک ہمہ پہلو، اور ہمہ وقتی مُبلّغ ہوتا ہے۔ تبلیغ کے لیے مقرر یا ادیب ہونا بھی شرط نہیں ہوتا بلکہ خود بولنے کی عمدہ صلاحیت رکھنا بھی قطعاً لازم نہیں ہوتا۔ ایک گونگی عورت اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی توحید کے اعلان و اظہار کے لیے آسمان کی طرف خاموشی سے انگلی اُٹھا دیتی ہے تو اس کی یہ حرکت بھی اعلانِ توحید اور تبلیغِ الوہیت میں شمار ہوتی ہے۔ مُبلّغ اپنی ہر حرکت سے اپنی تحریک اور مشن کے حق میں تبلیغ کرتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، لوگوں سے معاملات اور لین دین، دکھ درد میں شرکت اور ہمدردی و خیرخواہی غرض تبلیغ کی ہزار حکمتیں، ہزار شاخیں اور ہزار انداز ہیں اور ہر انداز اپنے اندر خوبی و رعنائی رکھتا ہے۔ بعض اوقات مُبلّغ اپنے صرف حُسنِ اخلاق اور میٹھے بول سے ہی دلوں کی فصل

کاٹ لے جاتا ہے۔

سپاہی (مجاہد) تحریکِ اسلامی کے کارکن کے کردار میں پوشیدہ تیسری شخصیت ایک سپاہی (مجاہد) کی ہوتی ہے۔ وہ ایک مستعد، چاق و چوبند ہمہ وقت تیار اور تحریک کی ضرورت پر اُٹھ کر چل پڑنے والا شخص ہوتا ہے۔ عذرات اس کے دامن کو نہیں روک سکتے جس طرح کوئی عذر اسے نماز سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ اپنے فریضے کو ادا کرنے کے لیے اپنی ساری مساعی صرف کرتا ہے۔ اس میں ایک سپاہی کی سی مستعدی، پابندیٔ نظم، توانائی و قوتِ کار، فرض شناسی، پھرتی، اطاعتِ امر اور حاضر باشی ہوتی ہے۔ وہ ایک عاشقِ جانباز کی مانند اپنے مشن کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ وہ اپنی جان کو صرف خدا کی امانت سمجھتا ہے اور خدا کی راہ میں اس کا ایثار و قربانی کا جذبہ اور اس راہ میں آگے بڑھنے کے لیے اس کی فوری تیاری خود بتاتی ہے کہ وہ اپنے مشن کا ایک جانثار سپاہی ہے۔

میرے نزدیک ان تین شخصیتوں کو اگر ایک فرد میں جمع کیا جائے تو اس سے تحریکِ اسلامی کا کارکن وجود میں آتا ہے۔

دو امانتوں کا امین تحریکِ اسلامی کا کارکن اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے پاس اللہ کی دی ہوئی امانتوں میں سے دو سب سے بڑی امانتیں ہیں:

اسلام اور زندگی۔ اور ان دونوں عظیم امانتوں میں سے بھی وہ پورے شعور کے ساتھ جانتا ہے کہ ترجیح کسے حاصل ہے۔ وہ زندگی بچانے کی خاطر اسلام کو قربان کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتا لیکن اسلام کو بچانے اور پھیلانے کے لیے وہ زندگی قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اس طرح اس کا مقصدِ زیست صرف اسلام کی سربلندی ہوتا ہے، دوسرا کوئی مقصد بھی اسلام کی سربلندی سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر انداز میں اسلام کی خدمت اور غلبے کے لیے ہی صرف کرتا ہے۔

اسلام کی خدمت کے لیے اس کی سب سے پہلی ضرورت تو اسلام کا وہ فہم و شعور اور علم و آگاہی ہے جس کے بغیر انسان اپنی پسند و ناپسند کو خدا اور رسولؐ کی پسند و ناپسند کے مطابق نہیں کر سکتا۔ اپنی دیگر تمام مصروفیات کے ساتھ اسے اسلام کے نظامِ زندگی سے ضروری اور کافی آگاہی مطلوب ہوتی ہے اور اپنی اسلامی شخصیت اور روح کی اس ضرورت کو وہ اسی تندہی اور توجہ سے پورا کرتا ہے جس طرح وہ اپنے جسم کی دیگر ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کیونکہ جسم اگر اپنی ضروریات حاصل کیے بغیر زندگی کا راستہ طے نہیں کر سکتا تو روح بھی اپنی مطلوبہ ہدایت کی روشنی حاصل کیے بغیر راہِ ہدایت پر گامزن نہیں رہ سکتی۔

ذوقِ بلند بلندیِ ذوق تحریکِ اسلامی کے کارکن کی خصوصیت ہے۔ جو شخص دنیا میں نظریات کے جنگل میں سے صرف اِسلام کو ہی اپنے لیے مقصدِ زندگی کے طور پر قبول کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کو ہی اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتا ہے اور دُنیا کے عیش وطرب اور نفسانیت کی لذات میں سے ایک صاف ستھری سیدھی سادہ پاکیزہ اسلامی زندگی کو ہی اپنے لیے لائحہ عمل کے طور پر قبول کرتا ہے وہ لازماً ایک بلند ذوق رکھنے والا انسان ہے۔ اس کی شان سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ تحریکِ اسلامی کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں کو اپنے لیے مثال بنائے اور ان کی خوبیوں سے صرفِ نظر کرے۔ وہ تو باغِ انسانیت میں پھولوں کی پسند رکھنے والا انسان ہے اور انسانیت کا سدا بہار پھول صرف نیکی بھلائی اور عملِ صالح ہے۔ وہ تو اپنے ساتھیوں کی اخلاقی کھیتی میں سے کانٹے چھوڑ دے گا اور پھول چُن چُن کر اپنی زندگی کا گلدستہ تیار کرے گا۔ یہی چیز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ:

"دُنیا کے معاملات میں اپنے سے نیچے کی طرف اور دین کے معاملات میں اپنے سے اوپر کی طرف دیکھو"۔

یعنی جو ساتھی دین کے اتباع اور پیروی میں سب سے بڑھ کر ہے جس کے اخلاق میں حُسن و خوبی زیادہ درخشاں ہے اسی کو اپنے لیے بطور مثال قبول کرنا اسلامی تحریک کے کارکن کے ذوقِ بلند کے شایانِ شان ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی خوبیں کو اپنے اندر جذب کر کر کے اپنے گلدستۂ اخلاق کو سب سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور جس قدر اس میں کامیاب ہوتا جاتا ہے اسی قدر وہ تحریک کا اچھا کارکن بنتا چلا جاتا ہے پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ خود بھی اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنے کردار کی اعلیٰ مثال پیش کرے۔ ہر دور کی تحریک اسلامی کے کارکنوں نے اپنے پیچھے اعلیٰ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایثار و قربانی کی مثالیں۔ تکلیف میں صبر و استقامت کی مثالیں۔ جان فروشی کی مثالیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی مثالیں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کی مزاحمت کی مثالیں۔ یہ مثالیں ہر تحریک کا سرمایہ ہوتی ہیں اور بعد میں آنے والی تحریکوں کے لیے اپنی پیش رو تحریک کی یہ بہترین زندہ وراثت ہوتی ہے جس سے لوگ جذبہ، فہم، قوتِ کار اور تقویت حاصل کرتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے اعلیٰ کارکن کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے قول و فعل و کردار کی اعلیٰ مثال قائم کرتا ہے اور تحریک میں جہاں جہاں اعلیٰ مثالیں موجود ہوتی ہیں ان سے بہترین استفادہ کرتا ہے۔

فہم و بصیرت و شعور تحریکِ اسلامی کا کارکن ایک باشعور انقلابی کارکن ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کس چیز کے خلاف برسرپیکار ہے اور کس چیز کا جانثار ہے۔ وہ کس شے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کس کو اُبھار کر سامنے لانا چاہتا ہے۔ وہ بیک وقت دینی، اخلاقی، انقلابی اور سیاسی ذوق رکھنے والا شخص ہوتا ہے۔ عبادات میں اس کے دینی ذوق کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ معاملات میں وہ اخلاقی حدود کی پوری پوری پاسداری کرتا ہے۔ باطل نظام کے مقابلے اور اسلامی نظام کو لانے

میں مخلص مگر غیر مصالحانہ انقلابی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، اور تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کے لیے مختلف تدابیر سوچنے میں وہ سیاسی حکمت عملی سے بھی پوری طرح بہرہ ور رہتا ہے۔ وہ کسی شیخِ طریقت کا اندھا مقلد نہیں ہوتا جو محض ایک طلسمِ خیال میں مبتلا ہو۔ وہ چشمِ بینا اور ذہنِ بیدار کے ساتھ نشاناتِ منزل کی شناخت کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں مسافر ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں ہوتا کہ

بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

نہ وہ کسی شیخ طریقت کے اشارے پر اپنی جا نماز شراب میں ڈبونے کے لیے تیار ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ جس کی وہ نماز پڑھتا ہے اس نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اور نہ وہ اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے پیرِ طریقت کی انگلی پکڑے بچے کی طرح چلتا چلا جائے، اس لیے کہ پیرانِ طریقت میں بعض "معلمانِ ملکوت" بھی ہوتے ہیں جو انسان کو تجرید کا نشہ پلا کر اسے اپنی نفسانی اغراض کے طلسمِ ہوشربا میں گم کر دیتے ہیں۔ وہ اسلامی حکومت کی وفادار رعایا کی طرح ایک بیدار مغز فرد ہوتا ہے جو بھرے مجمع پر قدغن کا حکم سن کر خلیفۂ وقت کو بھی ٹوک سکتا ہے اور اپنے رہنما کی رہنمائی ہمیشہ کتاب و سنت کے پیمانے سے ناپتا رہتا ہے۔ ایسا ہی کارکن کسی اسلامی تحریک کا وہ ہوشمند سرمایہ ہوتا ہے جو تحریک کو غلط موڑ مڑ جانے اور غلط راہیں اختیار کر لینے سے بچا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ آگے چلنے والے کی راہنمائی و اطاعت، معروف کی شرط اور فہم و شعور کی کسوٹی کے ساتھ ہی قبول کرتا ہے۔

محاسبۂ نفس | تحریک اسلامی کا کارکن ہمیشہ اپنے محاسبۂ نفس کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ بیرونی روک ٹوک سے پہلے اپنا جائزہ خود لیتا رہتا ہے۔ اپنے حقیقی مالک کے ساتھ اپنے تعلق کو خود ناپتا رہتا ہے۔ اپنے مشن کے ساتھ اپنی وفاداری اور کارکردگی کو خود تولتا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے خود سوال کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے مقصدِ زندگی کے لیے کس قدر ایثار و قربانی کر رہا ہے اور جس تحریک کو اس نے اپنی زندگی کا راستہ قرار دیا ہے اس راستے پر اس کے قدم کس رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں؟ اپنے ساتھیوں سے اس کے تعلقات کیسے ہیں؟ اپنے رفقاء سے اس کی رفاقت کا کیا حال ہے؟ اپنے قول کے مقابلے میں اس کے فعل و عمل کا کیا تناسب ہے؟ جن کو اس نے اپنا ساتھی بنایا ہے ان سے رفاقت کے تقاضے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا اس نے کتنا اہتمام کیا ہے؟ جس بات کو وہ سچا سمجھتا ہے اس کے پھیلانے میں اس کی کتنی قوت صرف ہوتی ہے؟ جس شے کو وہ غلط قرار دیتا ہے اس سے بچنے کا اہتمام وہ خود کتنا کرتا ہے؟ غرض اپنے ضمیر کے سامنے یا تو وہ سُرخرو ہے یا مجرم۔ اگر مجرم ہے تو کس بات کا مجرم ہے اور اس جرم سے بچاؤ کا اس نے کیا اہتمام کیا ہے؟ محاسبۂ نفس

تحریک اسلامی کے کارکن کے لیے ایک داخلی پیمانے اور ترازو کا کام دیتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو تول کر دیکھ سکتا ہے کہ اس کا وزن تحریک کے پلڑے میں کس قدر ہے۔ اس وزن کی کمی بیشی کے بارے میں جس صفائی، وضاحت اور انصاف کے ساتھ اس کا اپنا ضمیر اسے بتا سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں بتا سکتا اور اسی کا اہتمام اسے تحریک کے لیے ایک مفید اور مؤثر کارکن بننے میں مدد دے سکتا ہے۔

منصوبہ بند اور منضبط کام تحریک اسلامی کا کارکن جس تصورِ حیات کا قائل ہے اس کے لحاظ سے اس کا گزرتا ہوا ہر لمحہ اور اس کا کیا ہوا ہر کام خدا کے سامنے ناپا اور تولا جائے گا۔ اس احساس کی بنا پر وہ اپنے اوقات اور قوتوں کو بہترین انداز میں صرف کرتا ہے۔ جو قوت بھی اللہ نے اسے دی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں ضرور صرف کرتا ہے۔ تحریر و تقریر کی قوت، گفتگو اور مذاکرے کی صلاحیت، جسم و جان کی توانائی، علم و تدبیر کا ذخیرہ، اور مال و اسباب کے ذرائع سب کچھ وہ بہترین انداز اور ترتیب سے اپنے مقصدِ حیات کے لیے کام میں لاتا ہے تاکہ اس کی کوئی قوت بھی ضائع نہ ہو، نہ بیکار رہے اور نہ بے موقع صرف ہو۔

وہ ذہنی یکسوئی سے کام کرتا ہے، تقسیمِ کار کے اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتا ہے۔ کام کی مقدار اور وقت کی وسعت کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنا کام اس طرح سرانجام دیتا ہے کہ کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر کام سرانجام پا سکے اور وقت کو اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ سارے ضروری کام بروقت اور خوبی کے ساتھ انجام پاتے رہیں اور اس کی قوتوں کی کوئی رمق اور اس کے اوقات کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔

بارآور درخت کے مانند تحریکِ اسلامی کا ایک اچھا کارکن ایک بارآور درخت کے مانند ہوتا ہے جس سے تحریک ثمر حاصل کرتی رہتی ہے۔ وہ معاشرے میں نفوذ کر کے اپنے دائرۂ کار میں اپنے ساتھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ اصلاح کا عمل ایک خاموش مشین کی طرح اس کے ذریعے بروئے کار آتا رہتا ہے۔ وہ جب تحریک سے وابستہ ہوتا ہے تو اپنے دائرۂ اثر میں اس کے اثرات پھیلنے لگتے ہیں۔ لوگ اس سے متاثر ہو کر تحریک کی طرف آتے رہتے ہیں۔ بیسیوں لوگ ہوتے ہیں جو اس کے ذریعے اپنی آمد کا اعلان و اعتراف کرتے ہیں۔ اس کی زندگی سے سبق سیکھتے ہیں۔ اس کے طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی گفتگو سے تحریک کے نصب العین کے قائل ہوتے ہیں۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر تحریک کی کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہی اس کے بارآور ہونے کی علامت ہے کہ وہ ایک باغ کے ثمردار درخت کی طرح تحریک کے دامن میں اپنے پھل مسلسل ڈالتا چلا جاتا ہے۔

اخلاق کے عمومی خدوخال تحریکِ اسلامی کا کارکن ایک خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش گفتار، اور خوش طبع آدمی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہی خوبیاں اسے معاشرے میں نفوذ اور اصلاحِ افراد کے کام میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ بدمزاج،

غصہ ور، علیحدگی پسند، چڑچڑا اور آتش مزاج آدمی تحریک میں مفید کارکن ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ رابطہ و تعلق میں یہ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کارکن کے اندر دلنوازی کی صفت بدرجۂ اتم موجود ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو تو ساتھیوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ فراہم نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگمان حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

خوئے دلنوازی کے بغیر تحریکیں چلانا بھی مشکل ہوتا ہے اور چل پڑیں تو انھیں سمیٹ اور جوڑ کر باہمی پیوست رکھنا اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کارکن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم حاضرہ سے مناسب حد تک آگاہ ہو، تاکہ ہر نوعیت کے مخاطب سے وہ دعوتِ اسلامی کا تعارف کرا سکے اور مختلف نوعیت کی ذہنی الجھنوں کو صاف کر سکے۔ اسے پُراعتماد اور حق پرست ہونا چاہیے تاکہ اس کی شخصیت مخاطب پر اثرانداز ہو سکے، اس کی حق پرستی سے لوگ پورے پورے غیر جانبدارانہ طرزِ عمل اور انصاف کی توقع رکھ سکیں، اور کسی بے جا عصبیت اور ہٹ دھرمی میں مبتلا انسان محسوس نہ کریں۔ اسے بے جھجک اور بے لاگ بھی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ خندہ رُو اور خوش خُلق بھی تاکہ اس کی طبیعت کی خشکی اور یبوست دعوت سے متاثر ہو کر قریب آنے والوں کو دُور نہ پھینک دے۔ اسے ہمدرد اور خیر خواہ ہونا چاہیے اور اس کی خیر خواہی اس کی بات چیت، طرزِ عمل اور برتاؤ سے واضح طور پر محسوس ہونی چاہیے۔ ان خوبیوں سے وہ اپنے مخالف کے دل میں گھسنے کا راستہ بنا سکتا ہے۔ اس لیے کہ دل کا دروازہ وہ سنگین دروازہ ہے جسے باہر کی طرف سے کسی بڑی سے بڑی ضرب سے بھی کھولا نہیں جا سکتا جب تک کہ اندر کا مکین آنے والے مہمان کی خوبی سے متاثر ہو کر خود آگے بڑھ کر اس کے لیے اندر کی کنڈی نہ کھول دے۔

اس کے علاوہ اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں سُوءِ ظن سے بھی بچنا چاہیے، جب تک کہ بدظنی کی کوئی ٹھوس وجہ موجود نہ ہو۔ اور اگر ایسی وجہ موجود بھی ہو تو اس کی غیر حاضری میں اس کا ذکر اور چرچا کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے اس لیے کہ پیٹھ پیچھے کی بات پیٹھ میں خنجر گھونپنے سے زیادہ بڑا گھاؤ لگانے والی چیز ہوتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو تحفہ و ہدیہ کا اہتمام بھی دلوں کو جوڑتا ہے اور ان کے بارے میں نیک گمان اور اعتماد بھی باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے۔ باہمی تعلقات میں کسرِ دانکسار کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کسی حق پرستی کا نام نہیں ہے جس سے انسان نئے ساتھی بنانا تو درکنار پُرانے ساتھیوں تک کو قربان کر بیٹھتا ہے۔ اپنے رفقاء اپنے دوست ہی ہوتے ہیں اور دوستوں کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا بہترین ذریعہ رفاقت اور دوستی کا تعلق ہی ہے۔ محض ضابطہ کا تعلق تو ایک

ایسا کچا تاگہ ہوتا ہے جو جذبات کے ذرا سے کھنچاؤ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جو لوگ صرف ضابطے کے سہارے تحریکیں چلاتے ہیں وہ کبھی اپنے ساتھیوں کو سنبھال اور سمیٹ کر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ حضورؐ کا طرزِ عمل اپنے ساتھیوں سے اخوت، محبت، شفقت، احسان اور مہر و وفا کا طرزِ عمل تھا نہ کہ محض ضابطے کا تعلق۔ ضابطے کے تعلقات سے نہ انقلابی قربانیاں دی جاسکتی ہیں اور نہ انقلابی کارنامے سرانجام پا سکتے ہیں۔ سلطان باہو نے دل کی دنیا کے بارے میں کیا خوب بات کہی ہے۔

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہُو

جو کارکن اپنے ساتھیوں کو اپنی مٹھی میں سمیٹنے میں ناکام رہ جاتا ہے اور جو ساتھی اپنے ساتھیوں کے دلوں میں جھانک کر ان میں اُٹھنے والی لہروں کو نہیں پہچان سکتا وہ خود بھی ناکام رہتا ہے اور اس کے ساتھی بھی اپنا حقِ رفاقت ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باہمی تنبیہ و محاسبہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جو تحریک کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو تحریک میں خرابیاں پرورش پاتی رہتی ہیں اور آخر کار پوری تحریک کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ لیکن یہ کام نہ دشمنی نکالنے کے لیے کرنا چاہیے اور نہ دشمنی پیدا کرنے کے لیے ہونا چاہیے، بلکہ اس کا مقصد تو باہمی خیرخواہی اور بگاڑ کی اصلاح ہے۔ جو محاسبہ اور احتساب خرابی پیدا کرے وہ حکمت سے خالی ہے، اور جو تنقید ساتھیوں کو توڑنے کا کام کرے وہ قصائی کا چھرا اور قصاب کا بُغدا ہے۔ حدیثِ رسول کی رو سے مومن کو مومن کا آئینہ ہونا چاہیے۔ اور آئینہ کا کام بلاکم و کاست اور بلا تبصرہ و طعن حقیقت کو سامنے رکھ دینا ہے۔ اس کام میں آئینہ پیشانی پر بل تک نہیں لاتا۔ اور نہ آئینہ میں اپنی صورت پر کوئی داغ دیکھنے والا اُلٹا آئینے ہی پر بگڑ بیٹھتا ہے۔ دوسروں کی غلطیوں کو چننا پھر سمیٹنا اور پھر ان کو پھیلا اور پھیلا کر ان کا چرچا کرنا تحریک کو کانٹوں میں گھسیٹنے اور اس کی روح کو مضمحل کر دینے کے مترادف ہے۔ اور اپنی غلطی کی نشان دہی پر مشتعل ہو جانا بھی تحریک کے لیے کچھ کم تباہ کن نہیں ہے۔ اسی طرح تعلقات میں باہمی کسر و انکسار کا معاملہ ہے۔ اپنے ساتھی کے لیے جھک جانا اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اس کا کچھ بوجھ برداشت کر لینا باہمی پیوستگی کے لیے نہایت لازمی ہے۔ ایک ساتھی ایک وقت دوسرے کی بات برداشت کرے گا تو دوسرا بھی کسی دوسرے وقت اس کی بات برداشت کرے گا۔ اس طرح باہمی برداشت تحریک کے اندر ایک روایت کے طور پر چل سکتی ہے۔ یہ کوئی یکطرفہ ٹریفک نہیں ہے۔ اسی طرح باہمی تعلقات کو کاغذی اور ضابطے کے تعلقات سے آگے بڑھا کر انہیں حقیقی زندہ تعلقات کی صورت میں استوار کرنے سے ہی پائدار رفاقت وجود میں آتی ہے۔ کسی کے دکھ میں شرکت، کسی کے غم میں غم گُساری،

کسی کی شادی میں شرکت، کسی کی بیماری میں عیادت، کسی کو ہدیہ، اور کسی کو پیغام خیریت، غرض ایک زندہ تعلق جو ایک برادری کے افراد میں ہوتا ہے، وہی تحریک کے لیے پائدار زندگی کی ضمانت ہے۔

کتاب و کاغذ سے کوئی مضبوط رشتے استوار نہیں ہوتے، بلکہ عمل و کردار سے رشتے قائم ہوتے ہیں۔ کتابیں الماری میں اکٹھی رہ کر بھی علیحدہ رہتی ہیں اور انسان علیحدہ گھروں میں رہ کر بھی ایک دوسرے کے دل کے قریب رہ سکتے ہیں۔ پائدار رفاقت تعلقات کی رفاقت ہی ہوتی ہے، ورنہ لوگ بچھڑتے ہیں تو باہمی شناخت و پہچان سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک اسلامی کا کارکن اپنے دور میں معاشرے کا ایک نہایت ہی قیمتی فرد ہوتا ہے اور جب وہ ایک نصب العین کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے تو اس کی گاڑی کو اپنی پوری قوت سے کھینچتا ہے اور اس کی کشتی کو اپنے بازوؤں کی پوری توانائی کے ساتھ بادِ مخالف کے پیدا کردہ گردابوں سے اعلیٰ درجے کی ہمت و جرأت کے ساتھ نکال لے جاتا ہے۔ ایسے کارکن اگر تھوڑی مقدار میں بھی کسی اسلامی تحریک میں جمع ہو جائیں تو وہ تاریخ دعوت و عزیمت کا سرمایہ بن جاتے ہیں، اور اگر بڑی تعداد میں میسر آجائیں تو تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ کر اسے اپنے انقلاب کی منزل تک لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں

بقیہ اشارات:

جس طرح کہ دوسرے فرمانرواؤں کی گئی تھی۔ پھر ہم اس بات کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تحریک آزادی فلسطین کی باقی منظم [illegible] رہنماؤں کو جو یاسر عرفات کی تنظیم سے کسی طرح کم مؤثر نہیں، کن مصالح کے تحت نظرانداز کر دیا گیا۔

(بقیہ اشارات) وزیر اعظم سے یہ بات مخفی نہیں کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے خود الگ نہیں ہوا بلکہ بھارت اور مغرب کی اسلام دشمن طاقتوں، خصوصاً بھارت اور روس کی سازشوں سے یہ المیہ رونما ہوا ہے۔ اس کام میں بھارت کے ہندو، پاکستان کے سوشلسٹ اور دوسرے لادین عناصر روس کی سرپرستی میں ہمہ تن مصروف تھے کہ کسی طرح دین کی اساس پر قائم ہونے والے اس ملک کی تباہی کا سامان پیدا کیا جا سکے۔ ان لوگوں کے مذموم عزائم کے پیچھے تین محرکات کارفرما ہیں۔ ایک چین کے مقابلے میں مشرق کے اندر عظیم بھارت کی تشکیل جس کے ذریعے امریکہ اور روس کے سامراجی مفادات کی تکمیل ممکن ہو۔ دوسرے اسلام کی عملداری کا خاتمہ اور اس سے ملتِ اسلامیہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا ناپاک منصوبہ اور تیسرے دونوں بازوؤں میں آمریت کے تسلط کی راہ کی ہمواری۔ اسلام دشمن طاقتیں ان تینوں مقاصد کی تکمیل کے لیے برسوں سے مصروفِ عمل تھیں، جن کے نتائج اب کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر ان طاقتوں کو یہ موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ بڑی آزادی بلکہ ہماری رضامندی کے ساتھ ان خوفناک منصوبوں کو کامیابی کے مراحل تک پہنچائیں۔

اخلاقی اور قانونی اعتبار سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب بجز اس کے کیا ہے کہ جارح ہندوستان کو، جسے اقوامِ متحدہ کے ۱۰۴ ممالک نے بھی جارح قرار دیا ہے، نہ صرف جارحیت کے الزام سے بری تسلیم کیا جائے بلکہ اسے بنگلہ دیش میں "آزادی کی جنگ کرنے والوں کا نجات دہندہ" مانا جائے اور اس طرح استعماری طاقتوں کو یہ راستہ دکھایا جائے کہ پہلے پاکستان کے کسی حصے میں علیحدگی کے رجحانات کی پرورش کرو اور پھر جب چند سر پھرے باہر کی قوتوں کا اشارہ پا کر اس حصے میں شورش برپا کر دیں تو اسے آزادی کی جنگ کا مقدس نام دے کر ان شورش پسندوں کی تائید کے لیے اپنی مسلح افواج کے ساتھ آدھمکو اور اس طرح اس حصے پر قابض ہو جاؤ اور پاکستان سے یہ مطالبہ کرو کہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ناجائز قبضے کو صحیح اور درست مان لے۔ ممکن ہے بھٹو صاحب بھارت کے بارے میں کسی خوش فہمی میں گرفتار ہوں لیکن جو لوگ بھارت کی سامراجی ذہنیت سے واقف ہیں ان کے لیے یہ باور کرنا قریب قریب ناممکن ہے کہ بھارت اور اس کے روسی آقا صرف مشرقی پاکستان کو ہضم کر کے سیر ہو جائیں گے اور ان میں ھل من مزید کی کوئی حرص باقی نہ رہے گی۔ بھارت نے اس سے پیشتر جونا گڑھ پر ہاتھ صاف کیے، کشمیر پر ناجائز قبضہ جمایا، حیدرآباد کو ہڑپ کیا اور اس کی جوع الارض میں کوئی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ وہ آہستہ آہستہ ارد گرد کی ریاستوں کو نگل جانے کے درپے ہے۔ اور وہ خود بھی اور اس کا مربی روس بھی پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان میں جہاں کہیں بھی آزادی کی کوئی تحریک ابھرے گی وہ اسی طرح نجات دہندہ بن کر اس کی حمایت پر آئیں گے جس طرح کہ بنگلہ دیش کے لیے میدانِ عمل میں اترے ہیں۔ ہم محترم وزیر اعظم سے دریافت کرتے ہیں کیا وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان نئے اندوہناک حقائق کو، جنہیں یہ سامراجی قوتیں مناسب مواقع پر جنم دیتی رہیں گی، تسلیم کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اگر آپ اتنے ہی حقیقت پسند

ہیں تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ جس جماعت نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے اُسے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ پھر آپ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ آپ نے یہ فیصلہ دوستوں کے مشورے سے کیا ہے۔ کیا اس فیصلے کے لیے وہ وقت زیادہ موزوں اور مناسب نہ تھا جب پولینڈ کی قرارداد کے ذریعے ایک ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی جس سے ملک تقسیم ہونے سے بچ جاتا مگر آپ اس قرارداد کو پھاڑ کر اور بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں لوٹ آئے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر آپ بنگلہ دیش کے معاملے میں کیوں اتنے حقیقت پسند ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو مگر ہمیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں آزاد بلوچستان، پختونستان اور سندھو دیش بھی سامراجی طاقتوں کے اشارے پر حقائق کی صورت میں ہمارے سامنے نمودار نہ ہونے لگیں اور پھر ہم ان حقائق کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیے جائیں۔

بنگلہ دیش کے مسئلہ پر آپ کی تقریر دلپذیر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بنگال کے مسلمانوں سے ایک سال کی جدائی نے آپ کے اندر ان سے ملنے اور اُن کے ساتھ شیر و شکر ہونے کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک بڑا نیک جذبہ ہے اور دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کو ملانے کی خواہش بڑی مقدس خواہش ہے لیکن اس ضمن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آخر اس نیک جذبے کا اُس وقت کیوں مظاہرہ نہ کیا گیا جب آپ کے معمولی ایثار سے جدائی کے امکانات ہی معدوم ہو سکتے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن جس مزاج کے آدمی ہیں اور وہ اس وقت جس طرح اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے بھارت کے دستِ نگر ہیں، کیا ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی اس بات کا کوئی امکان موجود ہے کہ ہم بنگال کے مسلمانوں کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بھارت ہماری ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھے گا اور وہ ایک لمحہ کے لیے ہمارے کسی ایسے طرزِ عمل کو گوارا نہ کرے گا جس سے مشرقی بنگال کے مسلمان بھارت کے اثر سے آزاد ہو کر پاکستان کے اثر میں آ جائیں۔

بنگلہ دیش بھارت کی غلامی میں جس طرح جکڑا ہوا ہے اُس کا ممکن ہے عوام کو اندازہ نہ ہو مگر آپ تو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ۲۵ سالہ معاہدے کی رُو سے بنگلہ دیش کی تجارت، اس کی خارجہ پالیسی، اس کا نظامِ زر، سب بھارت کے تابع ہیں۔ بنگلہ دیش بھارت کی اجازت کے بغیر اپنی کوئی فوج نہیں رکھ سکتا۔ بھارت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی نوٹس کے بنگلہ دیش میں اپنی فوج داخل کر دے۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کے عوام کے ساتھ کوئی راہ و رسم پیدا کرنے کا خیال ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہم بھٹو صاحب کے اس رویہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پاکستان سے علیحدگی کے سب سے بڑے علمبردار اور اُن کے حامیوں سے تو تعلقات استوار کرنے کے لیے وہ سخت بیتاب ہیں لیکن انہیں اُن مسلمانوں کے دُکھ درد کا کچھ احساس نہیں جنہوں نے ایک پاکستان کے

قیام کے لیے بے مثال قربانیاں دیں اور جو آج بھی اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ بھارت کے چنگل سے نکل کر پاکستان سے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ان لوگوں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ مجیب الرحمٰن کے قول کے مطابق ایک کروڑ ہے اور اس کشمکش میں برسرِ اقتدار پارٹی کے اخبار کی اطلاع کے مطابق، قریب قریب ایک سو نمایاں افراد قتل ہو چکے ہیں۔ یہ سب حقائق کیا اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان اس زبردستی قائم ہونے والے بنگلہ دیش سے راضی نہیں۔ اس حالت میں کیا ہمارا اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرنا ان بے چاروں کی پشت میں چھرا گھونپنے کے مترادف نہیں۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے اُن بہاریوں کو بھی نگاہ میں رکھنے کی ضرورت تھی جو پاکستان کی خاطر پہلے ۴۷ء میں برباد ہوئے اور اب ایک پاکستان کی حمایت کے جرم میں بنگال کے لادین عناصر کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان بیچاروں کا کس وسیع پیمانے پر قتل ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کے ایک ترجمان کے مطابق ۲ لاکھ ۸۰ ہزار بہاریوں نے اپنے مستقبل کا فیصلہ معلق رکھا ہے۔ ایک لاکھ ۴۰ ہزار بنگلہ دیش میں رہنے پر مصر ہیں اور ایک لاکھ ۴۰ ہزار نے مغربی پاکستان میں آباد ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بہاریوں کی کُل آبادی ۳۵، اور چالیس لاکھ سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اگر ہم ۳۵ لاکھ ہی تسلیم کر لیں تو ان چھ لاکھ بہاریوں کے علاوہ باقی ۲۹ لاکھ کہاں گئے۔ کیا اُنہیں زمین نگل گئی یا آسمان اُچک کر لے گیا۔ اگر مشرقی پاکستان کے بپھرے ہوئے لادین عناصر نے اُنہیں موت کے گھاٹ نہیں اُتارا تو انہیں کیا ہوا ہے۔ کیا یہ بیچارے اس بات کے مستحق نہیں کہ ہم ان ستم زدوں کی دلجوئی کرتے ہوئے ان عناصر کو اپنے سے دُور رکھنے کا التزام کریں جنہوں نے ہندو کے ایما پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔

جس ڈرامائی انداز سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی فوج کے جذبات اور مغربی حکومت کے ان کارکنوں کے احساسات کو کبھی کسی لحاظ سے قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا جنہوں نے بھارتی جارحیت کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور نہایت پُرآشوب حالات میں مشرقی پاکستان کے انتظام و انصرام کو سنبھالا۔ کیا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد ہماری فوج اور انتظامیہ کے اندر داخلی اور خارجی شورشوں کو پوری قوت سے دبانے کا کوئی داعیہ باقی رہے گا۔ کیا وہ اس فیصلے کے بعد اس انداز پر سوچنے میں حق بجانب نہ ہوں گی کہ شورش پسندوں کی سرکوبی کرنے کے بجائے خاموش تماشائی بن کر حالات کا رُخ دیکھتے رہو اور اگر شورش پسند قوت و طاقت حاصل کرتے نظر آئیں تو پھر اُن کے ساتھ شامل ہو کر آزادی کے علمبردار بن جاؤ۔ بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے یہ تو فرمایا ہے کہ انہوں نے یہ قدم دوستوں کے مشورے سے اٹھایا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کے اِس دوست کا اس بارے میں کیا ردِّ عمل ہے جس نے ہماری ہر آڑے وقت میں مدد کی اور جو روس کی اس شاطرانہ چال کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح وہ ایک منصوبے کے تحت بھارت کی وساطت سے اُس کے

ارد گرد اپنا حلقہ تنگ کرتا جا رہا ہے۔ کیا چین اور دوسرے ایسے تمام ممالک جنہوں نے ہمیں صحیح اور برحق سمجھتے ہوئے بنگلہ دیش کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا بلکہ بھارت اور روس سے لڑائی مول لے رکھی ہے انہیں بھی اس مشورے میں شامل کیا گیا ہے۔ اندرونی حالات سے تو ہم واقف نہیں لیکن ظاہری حالات صاف بتا رہے ہیں کہ جس فنکاری کے ساتھ ہمارے وزیر اعظم نے بنگلہ دیش تسلیم کیا ہے اُس سے اس ملک کے عوام کو تو ممکن ہے کسی حد تک دھوکہ دیا جا سکے مگر زیرک مدبّروں کو دھوکہ نہیں دیا جا سکے گا۔ اور اگر یہ قدم ان کے مخلصانہ مشورے اور رضامندی کے بغیر اُٹھایا گیا ہے تو پھر یہ ہمارے لیے کسی طرح بھی اچھا نہ ہوگا کیونکہ اس سے عالمی برادری میں ہمارا وقار بالکل گر جائے گا اور ہمارے کسی قول اور مؤقف پر ہمارے دوستوں کو اعتماد نہ رہے گا اور اس سے ہمیں جو نقصان اُٹھانا پڑے گا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ہم پوری دیانت داری سے اسے حکمران طبقوں کی محض خام خیالی سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی موجودہ حکومت کے ساتھ جو ایک لادینی اور نسلی ریاست ہے تعلقات اُستوار ہونے سے مسلم بنگال کے ساتھ تعلقات بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ ہمیں تو یہ خطرہ لاحق ہے کہ ان تعلقات کی آڑ میں اس خوفناک لابی کو جو بھارتی ہندوؤں اور روس نواز اشتراکیوں اور دوسرے لادینی عناصر پر مشتمل ہے اور جس نے مشرقی پاکستان کو تباہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے، اسے مغربی پاکستان میں جہاں اسلام دشمن عناصر پہلے سے مصروفِ عمل ہیں، کام کرنے کا وسیع میدان ہاتھ آجائے گا اور چونکہ اسی لابی کو مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کا اچھا خاصا تجربہ حاصل ہو چکا ہے اس لیے وہ مغربی پاکستان میں بھی اپنی مذموم کارروائیوں کو زیادہ ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ جاری رکھ سکے گی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور ان عناصر کے خطرناک منصوبے خاک میں مل جائیں۔ مگر اس قسم کے خدشات کو خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا ہے، خصوصاً ان حالات میں جب کہ بھارت اور روس آزادی کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے پر مصر ہیں اور پوری دُنیا اُن کے تصوّرِ آزادی اور اُس کے مضمرات سے بھی بخوبی واقف ہے۔

ہمیں اس بات کا شدید رنج ہے کہ جن صفحات میں ہم بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے سانحہ کا ذکر کر رہے ہیں اُنہیں صفحات میں ہمیں اسلامی سربراہی کانفرنس کے بارے میں ایک دو ضروری باتیں عرض کرنا پڑ رہی ہیں، لیکن ہمیں اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نظر نہیں آتا کیونکہ وزیر اعظم بھٹو صاحب نے اپنی بے تدبیری یا غیر معمولی ہوشیاری سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا دُنیائے اسلام کے سارے سربراہ لاہور میں جمع ہی

اس غرض سے ہوئے تھے کہ کسی طرح پاکستان پر دباؤ ڈال کر اُسے بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کانفرنس کی جو روداد منظرِ عام پر آئی ہے، اُسے دیکھنے سے اس تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ان نامور فرمانرواؤں کے سامنے یہی ایک سب سے اہم مسئلہ تھا جسے طے کرنے کے لیے وہ بیتاب تھے۔ بھٹو اور مجیب ملاقات کے لیے انور سادات اور ان کے انداز پر سوچنے والے دوسرے سربراہوں کی سرگرمیاں، کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلے کی پذیرائی، پھر انور سادات کی کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی دہلی میں اندرا گاندھی سے ملاقات اور اندرا گاندھی اور روس کے سربراہ کا اس فیصلے کے بارے میں مسرت و شادمانی کا اظہار اور کرنل قذافی کا پاکستان کے مختلف حصوں کا دورہ اور اس فیصلے کی حمایت میں اُن کا عوام سے خطاب اور شاہ فیصل کا معنی خیز سکوت سب باتیں بہت سے شبہات کو جنم دیتی ہیں۔ اور ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ کانفرنس محض ایک کھیل تو نہ تھا جو اشتراکی لابی کے ایما پر کھیلا جا رہا تھا۔ دُنیائے اِسلام کی بے بسی کا اس سے زیادہ تکلیف دِہ منظر کیا ہو سکتا ہے کہ پہلے تو ان اسلام دشمن عناصر نے بھارتی جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کر دیا اور پھر پوری دنیائے اِسلام کے سربراہوں کی موجودگی میں میزبان ملک پاکستان کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ بھارت نے جارحیت کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ کچھ زیادتیاں اسی سے سرزد ہوئی ہیں، جن کا ازالہ کرنے کے لیے وہ تیار ہے اور اس سلسلے میں اس پر جو ذمہ داریاں بھی عائد ہوں گی وہ اُن سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گا۔

اگر پاکستان کے حکمرانوں کو غیر ملکی طاقتوں نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر مجبور ہی کر دیا تھا اور وہ اس معاملے میں بالکل بے بس ہو چکے تھے تو زہر کا یہ پیالہ کانفرنس سے پہلے اور کانفرنس کے بعد بھی پیا جا سکتا تھا۔ کیا اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ہم اسے ایک ایسے موقع پر پییں جب پوری دُنیائے اِسلام کا جاہ و جلال کفر کی طاقتوں کو اپنی قوت کا احساس دلانے کے لیے ایک جگہ جمع ہُوا تھا۔

پھر بھٹو اور مجیب کے درمیان مصالحت اگر ایک مسئلہ ہے ، فلسطین کی آزادی اور بیت المقدس کی بازیابی اگر ایک مسئلہ ہے، اور عرب کے مقبوضہ علاقوں کو یہودیوں کے تسلط سے آزاد کرانا ایک مسئلہ ہے تو مقبوضہ کشمیریوں پر بھارت کا بے جا تسلط اور محکوم کشمیریوں کی داد رسی بھی تو ایک مسئلہ ہی ہے جو دُنیائے اسلام کی توجہ کا اس طرح محتاج ہے جس طرح کہ دوسرے مسائل۔ معلوم نہیں اس مسئلے کو کانفرنس کے شرکاء نے کیونکر قابلِ التفات نہ سمجھا اور آزاد کشمیر کے منتخب صدر کو کانفرنس میں شرکت تک کی دعوت نہ دی گئی درآنحالیکہ آزادیٔ فلسطین کے علمبردار یاسر عرفات جس کی ایک اِنچ خطۂ زمین پر بھی حکمرانی نہیں اسی طرح پذیرائی کی گئی

(باقی صفحہ [illegible] پر)

مطبوعات

سرِّ دلبراں

اردو مجموعہ کلام، جناب حمید کوثر۔ ناشر : زرین بک ایجنسی ۶۱۔ ریلوے روڈ لاہور
سفید کاغذ کے ۲۰۰ صفحات۔ کتابت ٹائپ۔ قیمت مجلد -/۱۵ روپے

شاعری حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا نام ہے۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان شاعر سے اس امر کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ اُس کا کلام پڑھ کر قوم کے پاکیزہ و شریف احساسات اُبھریں۔ اُس میں بلند حوصلگی و علو ہمتی پیدا ہو، اُس کی خودداری و عزتِ نفس میں اضافہ ہو اور اُس کا کلام حال کی پستی و ناکامی کو عہدِ ماضی کی عظمت و رفعت اور کامرانی وظفرمندی میں بدلنے کا ولولہ بیدار پیدا کردے۔

اس معیار پر جب ہم سرِّ دلبراں کو پرکھتے ہیں تو ہمیں قدرے اطمینان ہوتا ہے۔ جناب حمید کوثر نے ایک مسلم کے ملّی احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ موصوف ادب برائے ادب کے قائل نہیں بلکہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے مقصد کے قائل ہیں۔ ان کے کلام کا اکثر حصہ فکری پختگی، شعری محاسن، شکوہِ الفاظ اور ادبی چاشنی سے مملو ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں کامیاب شاعری کی ہے اور زیرِ نظر مجموعہ منظومات، غزلیات، رباعیات اور رزمیہ اشعار کا حسین مرقع بن گیا ہے۔ کاش وہ اِس قسم کے سطحی اشعار سے اپنے مجموعۂ کلام کو پاک رکھتے جیسے

فطرت کے تغزل میں کوئی کیف نہیں ہے   کانوں میں ذرا ڈال دے اے یار چھنا چھن
یہ تعلق خدا سدا رکھے   قید میں ہوں حسین باہوں کی

یہ شعر وزن سے گر رہا ہے :

سامنے اپنے کھڑا ہوں ایسے   کوئی سرتا پا خطا ہو جیسے

قرآن مجید

- وہ عظیم المرتبت کتاب جو ملتِ اسلامی کے وجود کی محافظ ہے اور جس کا محافظ خود خدا ہے۔
- نوخیز نسل کے روشن مستقبل کی ضمانت قرآن کی تلاوت، تدبّر اور تعلیم میں ہے۔

— اسلامی تاریخ کے ہر دور میں — ملتِ اسلامی کی ہر نسل نے — مشرق و مغرب کی ہر مسلمان قوم نے قرآن کے ہر ہر لفظ کو سینوں میں اور صحیفوں میں محفوظ رکھا۔

قرآن کے علوم و افکار کی اشاعت کے ساتھ اس کے ظاہری جمال حسن قرات اور صحتِ ادا میں بھی کار ہائے نمایاں انجام دیتے ہیں — **مگر دورِ حاضر میں:**

پاکستان کے محققِ جلیل جناب **مولانا ظفر اقبال** کی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے بعد پیکیجز لمیٹڈ کی طرف سے شائع ہونے والا **تجویدی قرآن مجید** — نہ صرف

ہندو پاک کے اندر — بلکہ —

از انڈونیشیا تا مغربِ اقصیٰ — اور — از ترکیہ تا جنوب افریقہ

اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس میں وہ تمام خوبیاں جمع ہو گئی ہیں جو عربی ممالک کے مصاحف اور مشرقِ بعید و مشرقِ اوسط کے مصاحف میں پائی جاتی ہیں نیز — آغاز میں ایک طویل مقدمہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے جس میں اعضائے صوتی، دانتوں کے نام، مخارج، حروف ہجا، علاماتِ ضبط، رسم الخط قرآنی اور رموزِ اوقاف کو نہایت سہل زبان میں بیان کر دیا گیا ہے۔

- اور آخر میں فہارس دیئے گئے ہیں جن میں قرآن مجید کے منازل، اجزاء، سورتوں کی موجودہ ترتیب، سورتوں کی نزولی ترتیب، ہجائی ترتیب اور عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں رموزِ اوقاف بیان کیے گئے ہیں
- فاضل محقق نے املا کے جدید ضابطے وضع کیے ہیں جن کی بدولت علم التجوید قرآن کے املا میں سمٹ کر آ گیا ہے اور عام ناظر خود بخود علم التجوید سے آگاہ ہوتا جاتا ہے۔

آرٹ پیپر، اعلیٰ دو رنگی طباعت، جلی حروف، مع پلاسٹک کور اور خوشنما ڈبے میں بند

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۱۰۲۴ ہدیہ صرف **۲۵** روپے۔ ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

تجویدی قرآن مجید حاصل کرنے کے لیے **ادارۂ ترجمان القرآن** اچھرہ، لاہور کو آرڈر دیجیے